میٹھا سچ

2019



ڈاکٹر سلطان محمود

مٹھاچ

1۔نام کتاب سلطانی گواہ

2۔مصنف ڈاکٹر سلطان محمود

3۔طباعت یاسر قریشی، انعم عروج

4 ۔صفحات 135

5۔ناشر سنگت پبلیکیشنز ،لوئر مال لاہور

6۔قیمت 400 روپے

انتساب

ان تمام محبِ وطن قارئین کے نام
جو ملکی حالات پر صرف کڑھ ہی سکتے ہیں

فہرست مضامین

دیباچہ

سچ ہمیشہ نہیں تو اکثر اوقات کڑواہی ثابت ہوتا ہے،اور یہ کڑواہٹ سچ بولنے والے کے مزاج اور طبیعت میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔مگر سچ کی تاثیر اکثر نہیں بلکہ ہمیشہ ہی میٹھی محسوس ہوتی ہے اور بعد میں آنے والے اثرات شہد سے بھی کہیں میٹھے ثابت ہوتے ہیں۔اس کے برعکس جھوٹ اکثر اوقات شہد سے بھی میٹھا محسوس ہوتا ہے مگر اس کے بعد میں آنے والے اثرات نیم سے بھی کڑوے ثابت ہوتے ہیں۔ڈاکٹر سلطان صاحب ایک بہادر انسان ہیں جنہوں نے اپنے کالمز میں سچ کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ زندگی کی بہت سی تلخیاں اور کڑواہٹیں پی چکے ہیں ورنہ سچ کی سویٹ ڈش بنا کر پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کر دینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

''میٹھا سچ'' ڈاکٹر سلطان محمود صاحب کے محبت بھرے تلخ نامے، کھٹے میٹھے افسانے، دلچسپ کالمز اور ان سب کو ملا کر ایک منفرد مجموعہ جو ان کے کالم میٹھا سچ کی شائع شدہ شکل ہے، گویا کہ زندگی کے قیمتی لمحات میں لپٹی ہوئی غیر معمولی کتاب جب میرے ہاتھ میں آئی تو سب سے پہلے میں نے کالمز کے عنوانات کا جائزہ لیا اور وہیں رک گیا۔الفاظ کا دلچسپ چناؤ جب نظر سے گذرا تو کتاب اپنی منظر کشی خود کرنے لگی، میں اُن احساسات کو ہرگز ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا جو چھوٹے چھوٹے خوبصورت لفاظی دائروں میں اُبھرتے چلے جارہے تھے۔کتاب کے عنوانات یوں محسوس ہو رہے تھے کہ جیسے کسی نوزائیدہ بچے کی ہلکی ہلکی سی مسکراہٹ، چھوٹے چھوٹے سے قہقہے یا پھر ہلکا پھلکا رونا یا پھر ایک دم سے چیخنا اور بلکنا۔ڈاکٹر صاحب کی کتاب الفاظ کے تال میل پر خود بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور یہ بھی بیان کرتی نظر آتی ہے کہ اس کا جنم ایک غیر معمولی جنم ہے اور یہ کوئی عام تخلیق نہیں۔

پہلے عنوانات پر ہی بات کرتے ہیں، اُن کڑوے حقائق کی بات کرتے ہیں، جن کا سامنا وقتاً فوقتاً حالات و واقعات کی مناسبت سے ہوتا چلا گیا۔یہاں میں سبھی عنوانات کا ذکر تو نہیں کر سکتا مگر کچھ چھوٹے اور اُچھوتے عنوانات شامل کیے بغیر بات مکمل ہی نہیں کی جاسکتی، جیسا کہ بریکنگ نیوز، سیاسی ڈرائی کلین، پرویزوں سے شریفوں تک، اصلی ڈاکٹر معالج نہیں ہوتا، تربیت بالغاں، پانی سے گاڑی چل سکتی ہے، دندان شکن، غیر سیاسی مشاعرہ، قومی اسمبلی کرکٹ میچ، اللہ میاں کی گائے بمقابلہ بل فائٹر، عید برائے فروخت، کمسن گدھا، مولوی کنٹینر، ڈاکٹر کا علاج، ہمارے پاس بھی ملالہ ہے، جنسی جمہوریت، جیل سسرال ہتھکڑی زیور، انکل ماموں وغیرہ وغیرہ۔مندرجہ بالا عنوانات ماضی قریب کے چند سالوں کے چبھتے ہوئے سوالات ہیں جن کا انتشار ابھی تک بھی ہمارے ذہنوں سے زائل نہیں ہوا۔ڈاکٹر صاحب نے ان موضوعات پر خوب نشتر زنی کی ہے۔

یہ لفظوں کا زہر تھا جو ڈاکٹر صاحب اس امید پہ پیتے چلے گئے کہ ایک دن یہ کڑواہٹ اپنا ذائقہ بدلے گی اور یہ کڑوی املی ایک میٹھے اور خاص آم کی شکل اختیار کرے گی۔اور اس کی شناخت ایک منفرد تصنیف یعنی "میٹھا سچ" کے نام سے

ہو گی۔

ڈاکٹر صاحب کے کچھ تخلیقی نمونے ملاحظہ کرتے ہیں اور سر دھنتے ہیں:

آج کی بریکنگ نیوز کس درجے کی ہیں۔ ذرا ملاحظہ کریں۔" کراچی کے علاقہ گلشن میں مسلسل بارشوں کے بعد سینکڑوں مینڈک ٹرٹراتے دیکھے گئے۔ ناظرین حالیہ بارشوں سے شدید متاثرہ گلشن اقبال کراچی میں سینکڑوں مینڈک ٹرٹراتے ہوئے سڑکوں پر آ گئے۔ سینکڑوں مینڈک ٹرٹراتے ہوئے سڑکوں پر آتے دیکھے گئے۔ ایک بار پھر آپ کو بتاتے ہیں کہ سینکڑوں مینڈکوں کو گلشن اقبال کراچی کی سڑکوں پر ٹرٹراتے پایا گیا۔ ناظرین ہمارے خصوصی نمائندہ نے گلشن اقبال کراچی سے خبر دی ہے کہ سینکڑوں مینڈک بارش کے بعد سڑکوں پر ٹرٹرانے لگے۔ گلشن اقبال کراچی میں سینکڑوں مینڈکوں کے ٹرٹرانے کے سبب ٹریفک جام کے مناظر۔ مینڈکوں کو ٹرٹراتے ہوئے سڑکوں پر آتے دیکھا گیا ہے۔ (بریکنگ نیوز)

بجلی، پانی وغیرہ جیسے مسائل بھارت کو سونپ دیئے جائیں تاکہ وہ ہمارا کنسلٹنٹ لگ جائے اور ہمارے ہی پانی کو روک کر ہماری ہی بجلی بنا کر ہمیں ہی کرنٹ مارتا رہے۔ (سیاسی ڈرائی کلین)

اگر ووٹ نہ بھی دے سکے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ڈیڑھ سو اضلاع کے ہزاروں پٹواری بھلا کس لئے رکھ چھوڑے ہیں۔ ووٹ بنانا اور ڈالنا ان کا کام ہے۔ (اللہ اللہ خیر سلا) (پرویزوں سے شریفوں تک)

ہونہار وزیر اعظم پاکستان ذُلفی نے 1971 میں یوں ہاں میں ہاں ملائی کہ اقوام متحدہ کے اجلاس میں دنیا بھر کے سامنے پولینڈ کی قرارداد پھاڑتے ہوئے ایک نیا طاقتور قلعہ ہوا میں یہ کہتے ہوئے تعمیر کر کے دکھا دیا کہ ہم بھارت سے ہزار سال تک جنگ کریں گے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ خیر ان کا آدھا ہوائی قلعہ ڈھنے سے بچ گیا کہ جب دو ماہ بعد ہی بھارت نے پاکستان کے ٹکڑے کر دیئے۔ (پانی سے گاڑی چل سکتی ہے)

پڑوسی بُل فائٹر جو پہلے عوام کو سُرخ جھنڈی دکھا کر بھڑنے پر مجبور کرتا رہا تھا اب دھوکہ دے کر بالآخر بھرے ہوئے بھینسے یعنی عوام کے کندھوں پر چڑھ دوڑا ہے۔ اب اسے ڈر لگ رہا ہوگا کہ اگر اس بھرے ہوئے بھینسے نے اُسے پٹخنی دینے اور سینے پر زوردار ٹکر رسید کرتے کے لئے اچھل کود کا اودھم مچا دیا تو کوئی ہڈی پسلی سلامت رہنے کی امید باقی نہیں۔ لہٰذا اسے اب اپنی جان، آن اور شان بچانے کے لئے آہستہ آہستہ اللہ میاں کی گائے بننا پڑے گا۔ (اللہ میاں کی گائے بمقابلہ بل فائٹر)

آپ پر پنجاب کا بجٹ صرف لاہور پر صرف کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ آپ پر یہ بھی الزام دھرتے ہیں کہ آپ صرف ماشیوں کی باتوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ زیادہ خطرناک بات یہ کرتے ہیں کہ عملاً صوبہ پنجاب آپ نے اپنے بیٹوں بھانجوں کے حوالے کر رکھا ہے اور خود سیاسی شعبدہ بازیاں کرتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں جناب یہ آپ کے بڑے بھائی کو بھی نہیں بخشتے اور الزام لگاتے ہیں کہ وہ بھارت کو جو پسندیدہ ترین ملک کا درجہ دینا چاہتے ہیں اس کے پیچھے ان کا مقصد بھارت میں چلتے ہوئے اپنے اربوں کے کاروبار کو بچانا ہے۔ گو کہ یہ حضرت ذاتی طور پر آپ کی حکومت کو زرداری کی حکومت سے بہتر سمجھتے ہیں لیکن لوٹ مار میں اس کے برابر سمجھتے ہیں۔ یہ بھی الزام آپ پر تھوپتے ہیں کہ آپ عالمی

طاقتوں کے آلہ کار ہیں اور بھارت کی خواہش پوری کرنے کے لیے نہ تو پانی سے بجلی بنانے کے بڑے منصوبے مکمل کرانا چاہتے ہیں اور نہ ہی پاکستان میں بھارتی دراندازی پر کوئی روک ٹوک رکھنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ ملک میں بلدیاتی انتخابات نہیں ہونے دیں گے۔ مشرف کو سیاسی ڈرائی کلین کر دیں گے۔ (شکر ہے وہ خواب تھا)

سچی اور کھلی تحریریں اکثر اور بیشتر عام عوام کے احساسات کی نمائندگی کرتی ہیں، عام عوام ان کو پڑھتی بھی ہے اور سراہتی بھی ہے۔ کھرا سچ جہاں عوام کے دل کو چھوتا ہے وہیں ایوان کے دلوں پر بھاری بھی ثابت ہوتا ہے۔ ایسی باتیں جب استاد دامن اور حبیب جالب کیا کرتے تھے تو جیل کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ خواہ سامنے کوئی آمریت ہو یا پھر جمہوریت، کالے دامن والی کسی بھی سرکار کو سچ کبھی میٹھا نہیں لگا اور ہر سچے کو کسی نہ کسی جیل کا سامنا کرنا پڑا۔

مگر شائد آج حالات ویسے نہیں رہتے، حاکموں نے کرپشن کا طوق گلے میں کسی ایوارڈ کی طرح لٹکا لیا ہے اب اگر کسی پر سچ لکھا جائے تو وہ محسوس ہی نہیں کرتا بلکہ آگے سے یہ جواز دیتا ہے کہ اسے کرپشن وراثت میں ملی ہے، جیسے اس پر اس کے بڑوں کا حق تھا ویسا ہی اس پر میرا بھی حق ہے۔ دوسری طرف عوام میں بھی عجیب قسم کا شعور ہے، یعنی کرپشن تو سب کرتے ہیں، یہ دیکھیں کہ کم کرپشن اور زیادہ کام کون کرتا ہے۔ جب عوام میں بیداری کا لیول یہ ہوگا تو سچ لکھنے والے کو بھی اتنی ہی اہمیت دی جائے گی جتنا جھوٹ لکھنے والے کو۔ جیسے ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں، اللہ اللہ خیر سلا۔

میٹھا کھا کھا کے ہماری عوام کو میٹھے کی بیماری یعنی شوگر ہوگئی ہے، انہیں کون بتائے کہ سچ جیسا میٹھا انہیں کسی ڈاکٹر یا حکیم نے منع نہیں کیا۔ بلکہ حاکم نے اسے سننے سے بچانے کے لئے ان کے کان سن کر دیئے ہیں۔ اس طرح جیسے سچ سننے سے اس کے اپنے کان سن ہیں۔ بھلا ہو نہ سننے والوں کا ڈاکٹر صاحب ورنہ یہ ہو نہیں سکتا تھا یہ آپ ایک یا دو دفعہ حاکموں سے سیاسی سسرال سے ہو کر نہ آئے ہوتے۔ آپ کے دل کی کیفیت سمجھی جا سکتی ہے، بے بسی دیکھی جا سکتی ہے، کاش اللہ ہمیں ایسے حکمران عطا کرے جن پر لکھتے ہوئے ہمیں دلی خوشی اور مسرت ہو، اور ایسی عوام عطا کرے جو خود بھی سچ بولے اور سچ بولنے والوں کے ساتھ کھڑے ہونے کا حوصلہ بھی رکھتی ہو۔

جھوٹ کی نیند سونے والے حکمرانوں اور جھوٹ کے خوابوں میں رہنے والی عوام کے لیے میٹھا سچ ایک انمول تحفہ ہے، کاش یہ کتاب سوئی ہوئی عوام اور سوئی ہوئی حکومت کو جگا سکے۔ امین

میاں وقار الاسلام۔ پرنسپل کنسلٹنٹ آف مارول سسٹم

پیش لفظ

نہ کر بندیا میری میری۔۔۔

ایک بار ہم نے اپنا سی وی اپنے ایک یونیورسٹی رجسٹرار دوست کو کسی پوسٹ کے لئے دیا۔اس دوست کا دماغ منحنی جسم کی مناسبت سے 2 فیصد سٹینڈرڈ کے حساب سے محض چھٹانک برابر یعنی چھوٹا سا تھالہٰذا سی وی دیکھ کر فرمانے لگے کہ یہ میں جس کو بھی دوں گا وہ کہیں گے کہ ان حضرت نے تو اپنی تعریفیں خود کی ہوئی ہیں۔ہم نے برجستہ عرض کیا کہ آپکو دیا ہی اس لئے ہے کہ آپ اس میں تھوڑا سا بغض ڈال کر ہلکا کر دیں۔یہ حقیقت ہم نے اس لئے بیان کی ہے کہ اگر ہم خود بھی اپنے سی وی کو چار پر تقسیم کر دیں تو پھر بھی حیرت زدہ ہی رہیں گے کہ ہماری شادی کیسے ہوگئی۔اگر ملک عزیز میں میرٹ کا رواج ہوتا تو یقین کریں ہم ابھی تک کنوارے ہوتے کیونکہ کوئی بھی خاندان بقائمی ہوش وحواس ایسے کھنگ کو بیٹی نہ دیتا۔

ہم آٹھ برس کے تھے کہ ہمیں سوتے میں مسکراتے دیکھ کر بڑے ابا حضور نے قیافہ لگایا کہ یہ بچہ بڑا خوش قسمت ہوگا۔اس دور میں ہم بزرگوں کو جھٹلایا نہیں کرتے تھے۔لہٰذا بڑے ابا کی اس بات کو سچ ثابت کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے کا سوچ لیا۔سر کی بازی نے ہی دراصل ہماری قسمت بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہوگا کیونکہ بائیس برس کی عمر میں اس کی صفائی نے ہمیں انگزائٹی میں مبتلا کر دیا اور کالج و یونیورسٹی میں شروع کے سال خاصے دباؤ میں گزرے۔ستاروں پر یقین نہ رکھنے کے باوجود کسی آپا کا لکھا ہوا زائچہ پڑھا تو برج قوس کے لوگوں کو مزاحمتی و جارحیت پسند لکھا پایا۔ہم بہت حیران ہوئے کہ یہ آپا کہیں امی جان سے مل کر تو نہیں آرہیں،لیکن پتہ چلا کہ امی جان نے کراچی نہیں دیکھا اور آپا کو 1967 میں ہمارے ہاں لگنے والے گراہم بیل کے کالے فون کے نمبر 4138 کا پتا نہیں تھا۔لہٰذا زائچے والی آپا کی بات پر یقین کرنا پڑا۔شیشے میں بار بار اپنا سراپا دیکھ کر دکھ ہوتا رہا کہ اگر ہم سن 78 میں بائیس برس کے ہو کر بھی اٹھائیس کے لگ رہے ہیں تو چلو طویل پیشانی کے خلاف برج قوس کی وجہ سے مزاحمت کرتے ہیں۔بس پھر سن 79 میں سر کو محمد علی سٹائل میں ڈھانپتے ہی جب آس پاس سے حوصلہ افزائی ملی تو پہلا خیال بھی شاید یہی آیا کہ چلو اب زیبا کے ساتھ کوئی فلم کرتے ہیں۔

اعتماد شاید برج قوس کی کوئی خصوصیت رہی ہوگی لیکن ہم نے اعتماد کی بحالی ہوتے ہی اپنے آپ کو ہمیشہ ضرورت سے زائد پر اعتماد پایا۔چھوٹے نانا ریڈیو کے مانے ہوئے صداکار تھے لہٰذا ہماری زبان بھی انکی طرح ننانوے کی سپیڈ سے چلتی تھی۔ایک کریلہ اور اوپر سے لائل پور کے خصوصی ٹریڈ مارک یعنی جگت بازی نے اسے نیم پر چڑھا دیا۔اب ایسے ٹرک کے سامنے کون کھڑا رہے جو ننانوے کی سپیڈ پر بھی رفتار کم کئے بغیر بار بار ٹرن مار سکتا ہو لہٰذا تقریبا ہر میدان میں ہم اکیلے ہی اپنے آپ سے مقابلہ کر کے اول آجایا کرتے تھے۔ننھیال کی زبان دانی نیز تیزی

مسلمہ تھی۔ یعنی چھوٹے نانا جان کو پاکستان بننے سے قبل 1946 میں ہی ساڑھے تین کروڑ پنجابی روزنامہ جمہوردی آواز میں سرحد کے دونوں اطراف چوھدری صاحب کے نام سے سنا کرتے تھے۔ امی کے سگے چچا ہونے کے ناطے لائل پور میں ان کی آمد پر ان کا بسیرا بھی ہمارے گھر ہی ہوتا تھا لہذا کئی ایک سیاستدان قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہا۔ مثلاً سن 69 اور 70 میں مشرقی پاکستان والے نورالامین اور مغربی پاکستان والے نوابزادہ نصر اللہ خان ہمارے لائلپور والے گھر کو شرف مہمانی عطا کر چکے ہیں۔

چوھدری عبداللطیف مسافر جو لاہور ہوٹل کے عقب میں واقع سلیمان بلڈنگ کے مالک تھے ایک دن امی کی دوسری چچی لے آئے تو خاندان بھر کے دل میں دو بیویوں سے حظ اٹھانے کے سلسلے میں شاید حسد بھر گیا اور اپنی عجیب و غریب بیویوں کے جلو میں چل پڑے دوسری چچی کو طلاق دلوانے۔ پیش پیش میرے سیاستدان اور لٹھ مار قسم کے نانا عبدالمجید نظامی جو خاکسار تحریک کے تربیت یافتہ اکابرین میں سے ایک تھے اور روزنامہ پیسہ اخبار میں کوئی نوکری بھی کرتے تھے۔ لاہور کے دہلی دروازے کے سامنے کراچی کلاتھ مارکیٹ میں رہائش پذیر اور سامنے والی حجازی بلڈنگ میں ملازم تھے۔ انہوں نے چھوٹے بھائی عبداللطیف مسافر کو دم نہ لینے دیا اور پہلی بھابھی کے ٹھیکیدار بن گئے۔ اس سارے قصے میں جو کام خراب ہوا وہ یہ کہ دونوں ہی بیویاں چھوٹے نانا کے عقد میں رہیں اور اس سے زیادہ جو ستیاناس ہوا وہ یہ کہ چھوٹے نانا جان کی طلاق کے معاملے میں اسلامی مفکر غلام احمد پرویز سے مشاورت کے بہانے رہ و رسم چل نکلی، لہذا خاندان بھر میں دو بیویوں والے پرویزی کے نام سے مشہور ہو گئے۔

ہمارا گھرانہ بھی 1981 میں لاہور شفٹ ہو گیا۔ ایک بار ہم چھوٹے نانا کے ساتھ مقدس پارک گلشن راوی، سے حضرت واصف علی واصف کو ملنے اے بلاک گئے تو چھوٹے نانا کے ریڈیو کے ساتھی مرزا سلطان بیگ المعروف نظام دین بھی ساتھ ہو لئے۔ پیدل باہر نکلے ہی تھے کہ ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر ذوالفقار شاہ بخاری، جو کہ پطرس بخاری کے بھائی تھے، گاڑی سمیت آن حاضر ہوئے۔ لہذا پروگرام بنا کہ وہاں گاڑی پر جایا جائے۔ ہمیں یاد ہے کہ رستے میں نظام دین نے اپنے خصوصی جگتیہ انداز میں بخاری صاحب سے کہا کہ دیکھو چوھدری صاحب نے نواسے سمیت ہم سب کو تصوف کی راہ پر ڈال دیا ہے اور خود بے ہدایتے پرویز کو مولوی مانتے ہیں۔ ہم جونہی حضرت واصف کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو نجانے کہاں سے انہوں نے چھوٹے نانا کو دیکھ لیا فوراً ایک باوقار آواز ابھری، مسافر صاحب اندر آجائیں۔ دو ہی کرسیاں تھیں جن پر بخاری صاحب اور نظام دین براجمان ہو گئے حضرت واصف اپنی مخصوص چارپائی پر اور میں اور چھوٹے نانا دری پر۔ کافی دیر تک گفتگو چلی جو عملاً حضرت واصف اور چھوٹے نانا کے درمیان ہی ہوئی۔

اسی کم سنی میں ہمارا تعارف شورش کاشمیری، احسان دانش، مرزا منور، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، احمد ندیم قاسمی، کشور ناہید اور بہت سے دوسروں کی محافل سے جڑ گیا مگر سبھی جگہوں پر چھوٹے نانا ہی کام نہ آئے بلکہ ذرا ددھیال کا بھی ذکر کر لیں تو احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی کے پڑوسی میرے چچا سعید تھے جنہوں نے ازاں بعد صوفی تبسم، الطاف حسین قریشی، ان کے بھائی اعجاز حسین قریشی سے بھی ہمیں متعارف کرایا۔ وجہ چچا سعید کا ادیب عالم ہونا نہیں تھا۔ بلکہ کلام اقبال کا اردو حصہ از بر ہونا تھا۔ میرے ننھیال اور ددھیال ایک نسل اوپر جا کر آپس میں مل جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ دو

نسلیں نیچے جا کر کھل جاتے تھے۔اسی ناطے سے چچا کی چھوٹے نانا سے بہت دوستی تھی۔وجہ چچا کی خوشامدی طبیعت اور چھوٹے نانا کی خوشامد پسندی تھی۔لیکن جب ہم نے بچپن ہی میں گرمیوں کی چھٹیاں لاہور آ کر گزارنا شروع کیں تو معلوم ہوا کی دونوں بے حد فارغ تھے۔رہتے قریب تھے۔چھوٹے نانا ریڈیو پر شام کے اوقات میں مصروفیت کی وجہ سے صبح کے اوقات میں کوئی کام نہ کرتے تھے اور چچا جان کی مخولی طبیعت کے باعث یہ دونوں سارا دن سمن آباد مین مارکیٹ میں ملک برادرز کی بجلی کی دوکان پر گپیں ہانکا کرتے تھے۔

والدہ کے فرسٹ کزن خواجہ ظفر نظامی کئی کتب کے مصنف تھے۔جو ابتداء میں جنتری لکھا کرتے تھے۔ازاں بعد نوائے وقت میں قائد اور اقبال پر مضامین تحریر کرنے لگ گئے اور شہرت پا گئے۔وہ لائل پور کی مشہور ادبی لائبریری کے مالک اور بے مثال ادبی ذوق رکھنے والے انسان تھے۔ہماری ماموں ظفر نظامی سے گاڑھی چھنتی تھی ۔ابن صفی نے اتنے ناول لکھے نہ ہوں گے جتنے ہم نے پڑھ لئے تھے۔یعنی ایک ناول کئی بار۔

اب اندازہ کریں ایک بندہ لائل پوری ہو اوپر سے ابن صفی کی جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کو کئی بار پڑھ چکا ہو۔گائیکی میں محمد رفیع کو سنتا ہو۔اٹھک بیٹھک سید قاسم محمود صاحب کے علاوہ پروفیسر عظمت اللہ خان کے ساتھ ہو۔نماز مولانا شمس الرحمان کے پیچھے پڑھتا رہا ہو جو ماڈل سکول گول بازار کے دینیات کے استاد تھے۔اردو انگریزی اخبارات کا مستقل قاری بنے رہنے کے لئے ڈی گراونڈ میں جماعت اسلامی کے دارالمطالعہ کا مستقل رکن بن چکا ہو،پیپلز پارٹی سے پیدائشی بغض رکھتا ہو۔مشہور بابا سمو سے والے سے زیادہ چنے ڈلوا کر کھانے کے بعد ایک عدد پان اور سیون اپ کی بوتل کا شوقین ہو۔ہر سال اصلی والے استاد نصرت فتح علی خاں کو دو اینٹیں زمین پر رکھ کر تانگے پر سوار کرا کے اپنے خاندانی پیر حافظ الیاس صاحب کے ڈیرے پر اجمیر شریف کے عرس کا رت جگا بھی کرتا رہا ہو۔اسلامی جمیعت طلباء کے حافظ ہمایوں اکرام اور پھر زرعی یونیورسٹی کے حافظ اکرم اور ناظم جمیعت شاہد اسلم کی دلپذیر نگرانی میں رہ کر نہ داڑھی رکھے نہ نماز پڑھے۔اوپر سے نگینہ،بابر اور ریکس سینما میں فلمیں بھی دیکھا کرے۔پھر کسی کی زرخرید بنگالن بیوی کے عشق میں بھی گرفتار ہونا سیکھ جائے اور آہیں بھر بھر کر 220 غزلیں لکھ مارے اور یہ سارے کام 27 سال کی عمر سے پہلے کر کے یونیورسٹی میں اول بھی آ جائے بلکہ یونین کا نائب صدر منتخب ہو کر صدر بھی رہ جائے۔اور جس کے ساتھیوں میں زرعی یونیورسٹی کے کم عمر ترین پروفیسر ارشد مرحوم اور احسان الحق بھی ہوں۔مشاعروں میں جاتا ہو۔کوئز پروگرام جیت کر دلدار پرویز بھٹی سے گولڈ اور سلور میڈل بھی لیتا رہا ہو۔اور ان سب پر مستزاد یہ کہ دور شاگردی میں کھڈیوں پر قالین بننے کا کاروبار بھی کرتا ہو۔اور اچانک 27 سال کی عمر میں سسرال کو بھی پیارا ہو جائے۔تو خود سوچ لیں یہ شخص کیسا چوں چوں کا مربہ ہوگا۔ہمیں انگریز سے صرف اس لئے محبت ہے کہ جو ایسے شخص کو ورسٹائل کہتا ہے۔

اور یہی سلطان محمود بیو یورپ سے پی ایچ ڈی میں تعلیمی امتیاز لے کر اب ڈاکٹر سلطان محمود بن گیا ہے۔اور شاعری میں تخلص فائق رکھ کر برج قوس کی طاقت سے اپنے آپکو افضل اور بہتوں کو چول سمجھنے لگ جائے تو شاید مضائقہ اس لئے بھی نہ ہو کہ عظیم لوگوں سے ناطہ رکھنے والے اس نوجوان پر بچپن میں لاڈ پیار اور متمول گھرانے میں پرورش پاتے پاتے اچانک والدین کے دیگر دس بچوں والی بھاری چھت آن گرے اور جس کی زد میں آ کر اخلاقی و معاشی طور

پر 1980 میں فیصل آباد ہی میں ایک بار وفات بھی پا چکا ہو اور جس کے ابا جان اولاد کے نا قابل برداشت بوجھ کے باعث کچھ بے حس سے ہو کر عظیم لوگوں جیسے بزرگوں کے اثاثے کو سنبھال نہ پا سکے ہوں۔اور جس کی والدہ بھی 54 برس کی عمر میں بیماری اور غریبی کی حالت میں اس وقت وفات پا جائے جب یہ ابھی بمشکل کمانے کے قابل ہوا ہی تھا۔تو اس چوں چوں کے مربے نے اس سارے اونچ نیچ کے کھیل میں 1981 میں لاہور میں دوسرا جنم لیتے ہی اگر اپنے ذہن، جسم اور اخلاق کو پھر بھی سنبھال کر گیارہ کتابیں لکھ ماری ہوں، روزانہ دس صفحے کالے کرنے کی عادت بھی ڈال لی ہو، 1300 پبلک لیکچر دے کر ہزاروں کو اپنا مرید بھی بنا لیا ہو۔اپنا میگزین بھی نکال لیا ہو۔تین ادارے کھڑے کر لئے ہوں۔غیر ممالک سے پی ایچ ڈی پوسٹ ڈاکٹریٹ کے علاوہ دو ایم ایس سی جیب میں ڈالے پھر رہا ہو نیز والدین اور سسرال سے بے پناہ پیار اور عزت پا گیا ہو لہذا دو نمبری کئے بغیر ماہانہ ایک ملین کما کر 2016 میں محض سٹھیا جائے تو قابل معافی ہے۔

یونہی چراغ لالہ روشن نہیں ہوا جلتی رہی ہے شبنم شاداب رات بھر

بچوں کے ساتھ پٹھو گرم، شٹاپو اور اونچ نیچ کھیلنے والا، جوانوں کے ساتھ شطرنج اور کیرم کھیل کر بھی وہ اس عمر میں اپنے کمرے میں رات رات بھر پڑھتا لکھتا رہا ہو اس دور میں کہ جب اس کے ساتھی پتنگ بازی اور آوارہ گردی کر رہے ہوں۔تو ہمارے اپنے خیال میں اس نے جوانی ضرور ضائع کی ہے مگر وقت ہرگز ضائع نہیں کیا۔ورنہ گورنمنٹ کالج کی فیس نہ دے سکنے والا کروڑوں کے گھروں کا مالک بغیر ہیرا پھیری کے بن جائے تو یہ اس کی ساری اپنی محنت نہیں ہے۔ کسی اور ذات کی عطا ہے جو نچھاور شاید اس لئے ہوئی ہے کہ اس ڈاکٹر نے کبھی کسی کا برا نہیں کیا اور اس پر چار معتبر بزرگ عورتوں کی دعاؤں کی چھتری کچھ اس طرح سے تنی ہوئی ہے کہ صحت مثالی ہے، ذہن جلالی ہے، زبان نرالی ہے، طبیعت متوالی ہے سنتا قوالی ہے اور اب ساٹھ کے پیٹے میں بھی بھرپور جوانی ہے اور چونکہ ہر کام مرضی سے کرتا ہے اس لئے فرصت کے لمحات کی فراوانی ہے۔

یہ سب کچھ دل میں بے انتہا احساس کی چبھن کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔اور ایک احساس مگر بے بس شخص اپنے اردگرد پھیلے ظلم اور لوٹ کے نظام کو بدل نہ پائے تو پھر محض طنز کے نشتر چلا کر اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر سکتا ہے۔لہذا اگلے صفحات میں قارئین جو طنزیہ مضامین پڑھیں گے یہ اخبار میں صرف اس لئے چھپ گئے تھے کیونکہ عوام کو پڑھنے کا شوق نہ تھا اور حکومتی زعماء کے پاس پڑھنے کا وقت نہیں۔وگرنہ بقول وقار الاسلام: شورش اور حالب کی طرح دو ایک بار ڈرائنگ روم کی سیر کر ہی چکے ہوتے۔

میٹھا سچ

ڈاکٹر سلطان محمود صاحب نے ابتدائی تعلیم ایم سی پرائمری سکول لائل پور سے حاصل کی بچپن سے ہی تعلیمی میدان میں اپنی قابلیت کے سکے بٹھانے شروع کر دیئے اور اسی سکول سے کلاس ہشتم میں بورڈ میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ اور وہاں سے سکالرشپ لے کر میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں گورنمنٹ ڈگری کالج لائلپور سے بھی سکالرشپ لینے پر ایف ایس سی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ تعلیمی میدان میں اعلیٰ نتائج کی بدولت بولان کالج کوئٹہ میں ایم بی بی ایس میں با آسانی داخلہ ہو گیا۔ مگر اگلے ہی سال حالات کی ناسازی کے باعث ایم بی بی ایس چھوڑ کر زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں بی ایس اینمل ہسبنڈری میں داخلہ لے لیا۔ اس چار سالہ پروگرام میں بھی حسب عادت نمایاں پوزیشن لیکر یہ ثابت کر دیا وقت یہ فیصلہ بھی ان کے حق میں بہترین تھا۔ کیونکہ کبھی سوچا بھی نہ ہو گا فیکلٹی الیکشن میں نائب صدر اور صدر کے عہدوں فائز ہونے کے ساتھ ساتھ فیکلٹی میں نمایاں پوزیشن ملنے کا ان کا ریکارڈ تا دم تحریر کوئی سپوت توڑ نہ پائے گا۔ اس کے بعد کالج آف ویٹرنری سائنسز لاہور سے ایم ایس سی نیوٹریشن کی ڈگری لی۔ بعد ازاں وارسا اگریکلچر یونیورسٹی پولینڈ سے فوڈ سیکیورٹی میں پی ایچ ڈی میں باون ملکوں میں اول پوزیشن لے کر گولڈ میڈل، ہینڈ کرافٹڈ ڈگری اور دس ہزار ڈالر کا کیش انعام کے حقدار پائے۔ پاکستان سے باہر اپنی گورنمنٹ ملازمت کے گیارہ سالہ دور میں متعدد ممالک کے دورے کئے اور مختلف پروجیکٹ پر یورپین سائنسدانوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ بہت سے قومی و نجی اخباروں میں باقاعدگی سے لکھتے ہیں۔ کئی ایک کتابوں کے بھی مصنف ہیں۔ غرضیکہ ڈاکٹر صاحب اپنی ذات میں ہر فن مولا ہیں۔

لفافہ صحافی

جب ہمارے پختون دوست نے ہم سے ''لپاپہ'' مانگا تو ہم نے بدک کر اُسے گھورا کہ شاید یہ ہمیں طنزاً لفافہ کہہ رہا ہے لیکن اس کے سنجیدہ چہرے نے ہماری بدگمانی کافور کر دی اور ہم نے الماری سے ایک عدد ڈاک کا لفافہ اس کے حوالے کر دیا۔ یہ اس ظالم وقت کا ذکر ہے جب تن آسانی کی برکت سے ہم کئی کئی پہر بھوکے رہتے تھے۔ اس مالی و ذہنی کیفیت میں کسی نے ہمیں صحافی بننے کا مشورہ دیتے ہوئے لالچ دیا کہ یوں ہم اچھے اچھے ہوٹلوں میں پریس کانفرنس کے بہانے تو ند بھر کر کھانا کھا سکیں گے بلکہ دل بھر کے اور دن بہ دن کے، کئی بار تو دن بھر میں کئی کئی بار۔

ہم نے اسی لالچ کی مٹھاس میں ایک روز کسی اخبار کے دفتر کا چکر لگایا تو مینیجر کی ایک بھی گگلی پر کلین بولڈ ہو گئے کہ جب انہوں نے فرمایا کہ بھیا! کیمرہ اور قلم پکڑو کے نکل کو دجاؤ میدان بزکشی میں اور خود بھی کھاؤ ہمیں بھی کھلاؤ۔ ہمیں اس صحافتی حملے سے قعرِ مذلت میں ڈوبتے ڈوبتے بھی دفتر کا وہ چپڑاسی یاد آ گیا جس نے اپنے افسر کو آخر لگائی تھی کہ صاحب اگر آپ میرا کام کسی اور سے کرالیا کریں تو میں روزانہ داتا صاحب سے اپنا کھانا کھا آیا کروں گا اور آپ کے لئے لیتا آیا کروں گا۔

ابھی ہم پر صحافت طاری ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک روز سر کی طرح شفاف ذہن میں چکا چوندی محسوس ہوئی اور جاگیردار، سرمایہ دار اور سیاستدان کی تکونی سازش یکدم منکشف ہوئی کہ جب پہلے والا مرنے لگتا ہے تو وہ دوسرے کے قالب میں ڈھل جاتا ہے اور پھر دوسرا تیسرے کے وجود میں سما جاتا ہے۔ ہم نے بھی اس روز خوب زور لگا کر سوچا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر جاگیردار کا پسر سرمایہ دار ہے اور سرمایہ دار کا پسر سیاستدان تو آخر کوئی ان سب کا باپ بھی تو ہونا چاہئے اور تب سے اب تک ہم پر اپنے پیشے سے عشق طاری ہے۔

دراصل ستر کی دہائی میں پاکستانی سیاست نے اس زور سے انگڑائی لی کہ گردن تڑوا بیٹھی۔ پھر نوے کی دہائی میں جمہوری خواجہ سراؤں کے گھر کسی ادھورے لڑکے نے آمبلی کی شکل میں جنم لے لیا جسے شوقِ پرویزی نے چوم چوم کر مار ڈالا مگر بیوپاری بھی بھلا کبھی نچلا بیٹھتا ہے؟ تب اس نے شریفانہ ہوشیاری سے جاگیرداری کی سُتھن اتار کر سرمایہ داری کا پاجامہ پہن لیا جس سے انسان اور ادارے چیزیں بن کر رہ گئے۔ اگر ناچیز، چیز بن کر مال کما سکتا ہے تو پھر پیشے تو بنے ہی روزگار کے لئے ہوتے ہیں۔

اس بھیس بدل طوفان میں ہم جیسے تن آسان صحافیوں کی بھی سُنی گئی اور بہت سارے وہ جو کبھی سفید پوشی میں غربت چھپانے کے لئے عالمانہ انداز اختیار کر لیتے تھے اب انہوں نے مایا کے روشن فانوس تلے ظالمانہ منہ بنا لیا۔ فیس بک پر انگریزی میں اردو لکھنے والوں نے بھی اخباروں کا رُخ کر لیا، بس پھر کیا تھا، علم کا نشہ صحافت میں ڈھل گیا، صحافت

کا دولت میں اور دولت کا انگوری نشے میں ڈھل گیا۔ یہ ڈھلنا لڑھکنے میں بدل گیا اور بعض اعلیٰ پائے کے کالم نگاروں کو بھی ہم نے سری پائے سے پھسل کر ایوان ہائے جمہوریت میں اترتے دیکھا۔ آخر کار قلم نے اپنا لوہا منوالیا، اپنی قیمت پائی اور صاحبِ کالم نے قلم کی کمان بنا کر اس میں ''میٹھے سچ'' کا تیر چڑھا کر ایسا تاک کر نشانہ سیاستدانوں کی جیب پر مارا کہ ہر منجھا ہوا اور گنجا ہوا سیاستدان بھی اپنی چوکڑی بھول کر اپنی جیب سے رستے ہوئے مال وزر کے اس کو صحافی کی زبان پر ٹپکنے سے تمام تر کوششوں کے باوجود نہ روک سکا۔ اب تو سائیکل کی ڈھیلی چین کو دوبارہ اوپر چڑھا کر پاک ٹی ہاؤس کے سگریٹ ناک دھوئیں کے پیچھے دھندلائی ہوئی چُندیا والے صحافتی چہرے بھی آواری کی چمک دمک کے ماحول میں چندھائی آنکھوں سے چمکیلی ہنڈا اکارڈ کو یوں رعونت سے دیکھنے لگ گئے کہ جیسے یہ کار وہ ابھی اپنے ادنیٰ خادم کو ڈونیٹ کر دیں گے۔

تو صاحبو اور قدر دانو! اگر کراچی میں بھتہ خوری اور بوری اکٹھے رہ سکتے ہیں، لاہور میں چودھری اور پادری گٹھ جوڑ بنا سکتے ہیں، سرکس کے اصطبل والے مرکز میں جا کر مستقبل والے بن سکتے ہیں، کاروبار میں حاجی اور پاجی ایک گھاٹ پانی پی سکتے ہیں تو آخر صحافت میں کالم اور لفافہ کا گٹھ جوڑ کیوں نہیں ہو سکتا؟ اب آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میٹھے میٹھے سچ سے کس طرح پھسل کر اخبار کے کالم میں پناہ لے لی ہم نے اب دیکھئے مستقبل میں کیا تماشہ دکھاتا ہے ، ہمارے حصے کے ''لیا پے'' سے محبوب کی چٹھی نکلتی ہے یا بم والی پرچی نکلتی ہے، قائد کی تصویر والے کاغذ برآمد ہوتے ہیں یا عدالت کی تعزیر والے مچلکے، اب ہم پیچھے ہٹنے والے ہرگز نہیں کیونکہ ''خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے''

سیاسی ڈرائی کلین

ہم نے جونہی دنیا سے جڑے سرال سے نکل کر دنیا سے کٹے چترال میں قدم رنجہ فرمایا تو دو غیر متوقع لیکن خوش کن جھٹکوں سے بدن میں ایک سرور سا سرائیت کر گیا۔ اول یہ کہ چترال بھر میں ذاتی وجوہات کی بنا پر جنرل مشرف کی شہرت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اور دوئم روائتی وجوہات کے سبب وادی بھر میں امن ہی امن تھا۔ امن تو شاید اس وجہ سے تھا کہ سینکڑوں برسوں سے پہاڑوں میں گھرے چترال سے واردات کے بعد ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کے پاس بھاگنے کے آپشن بہت کم تھے۔ لہذا یہ انڈسٹری پروان نہ چڑھ سکی ہوگی۔ لیکن ہمیں اپنے کارگل کے ہیرو، افغان جنگ کے غازی، ڈرون کے درآمد کنندہ، دہشت گرد سیاستدانوں کے برآمد کنندہ، نیز، اتاترک کے پیروکار اور عتیقہ اوڈھو کے بھائی صاحب یعنی جنرل مشرف کی جگہ جگہ رنگ برنگی تصاویر نے چترال سے عشق کرنے پر مجبور کر دیا۔ بلکہ وہاں کی سیاسی صورتحال کو دیکھ کر آئی ایس آئی ہی کی عظمت کے نشے میں ڈبو دیا۔ سیاحت کے لحاظ سے وہاں کی اول محبت لواری ٹنل بنوانے والے مشرف کے حصے میں آئی ہے۔ دوسری محبت ائر پورٹ قائم کرنے والے ذوالفقار علی بھٹو سے کی گئی ہے۔ تیسرے نمبر پر مغرب سے ابھرتے ہوئے عمران خان کا طوطی بول رہا ہے۔ چوتھے اور پانچویں نمبر پر چوتھے اور پانچویں نمبر کی جماعتوں یعنی جماعت اسلامی اور ایم کیو ایم کے جھنڈے تھے۔ کہیں دبے دبے سے جھنڈے چھٹے نمبر کے فضل الرحمان کے بھی جھانکتے نظر آئے۔

اس سیاسی کھچڑی میں اپنے محبوب قائد جنرل مشرف کے تڑکے نے تو ہماری رالیں اس قدر ٹپکائیں کہ ہم نے ایک انتہائی دانشورانہ فارمولے سے اپنے ساتھیوں کے علم میں اس قدر اضافہ فرمادیا کہ واپسی پر کسی نے بھی پھر ہمارے ساتھ آنا پسند نہ کیا اور باقی سب اپنے مکروہ جذبات کے ساتھ گاڑی پر اور ہم "انش" پی آئی اے کے چیل برابر جہاز پر پھڑ پھڑاتے اسلام آباد جا گرے۔ ہمارے گروہ میں البتہ ایک صاحب ذوق خاتون ہمارے خیالات سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انہوں نے بڑی لجاجت سے ہمیں مخاطب کیا کہ اے صاحب کشف حضرت اگر مناسب سمجھیں تو اپنے سیاسی فارمولے میں ذرا تھوڑا سا دینی دھاکہ کرلیں اور حضرت مآب شیخ الاسلام جناب پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری کو بھی "فوجداری" حکمرانوں میں شامل کرکے اس نیم مردہ قوم کے تن بدن میں تھوڑی سی غیر ملکی جان ڈال دیں۔ چونکہ ہم خواتین کی بات کبھی رد نہیں کرتے اس لئے ان سولہ سالہ خاتون کے اڑتالیس سالہ تجربات والی درخواست قبول فرمالی۔ ملاحظہ کریں ہماری سیاسی اصلاحات کا ابتدائی خاکہ برائے پاکستانی حکومت و عوام:۔

1) دس برس تک انتخابات کے ڈھونگ پر پابندی لگا کر جنرل مشرف صاحب کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور تھما دیں۔ جس میں عمران خان وزیر اعظم، وزیر خارجہ الطاف بھائی، وزیر داخلہ طاہر القادری، وزیر طالبان فضل الرحمان اور وزیر

اسلام جناب منور حسن وغیرہ ہوں۔ پارلیمنٹ میں صرف مسلم لیگ ن اور ق لیگ کا دنگل ہوا کرے جو روزانہ جیو نیوز پر مسلسل چلتا رہے۔

2) تمام ملکی فیصلوں کا بوجھ واشنگٹن کے ناتواں کندھوں پر ڈال دیا جائے۔

3) ملک عزیز کی تمام زمین اور کاروبار فوج کے حوالے کر کے بیوروکریسی کو مستقل طور پر یورپ وامریکہ سیٹل کر دیا جائے

4) مسجدوں کے تمام لاوڈ سپیکر سپریم کورٹ کے حوالے کر کے انہیں حکم دیا جائے کہ سابقہ دور جیسے ہی فیصلے سناتے جائیں۔ تاکہ عوام الناس میں عقیدت تو طاری رہے لیکن عمل کی زحمت سے پرہیز ہی رہے۔

5) بجلی، پانی وغیرہ جیسے مسائل بھارت کو سونپ دیئے جائیں تاکہ وہ ہمارا کنسلٹنٹ لگ جائے اور ہمارے ہی پانی کو روک کر ہماری ہی بجلی بنا کر ہمیں ہی کرنٹ مارتا رہے۔

6) امیروں کو کلبوں میں اور غریبوں کو گھروندوں میں محصور کر کے ان کی ڈیوٹی لگا دی جائے کہ وہ صرف حلال بچے پیدا کرتے رہیں۔

7) تمام تعلیمی اداروں کو انٹرنیٹ کی سہولت دے کر ذمہ داری لگا دی جائے کہ عالمی تحقیقات کو اپنے ناموں سے شائع کرتے رہیں۔ اور روزانہ منحوس سکولوں کالجوں کی شکل دیکھنے کے بجائے موبائل فون پر ہی جنس مخالف سے سب کچھ کہہ دیں۔

8) گندم، گھی، چینی وغیرہ پیدا کرنے کی کوفت میں پڑنے کی بجائے صرف درآمد کی جائے اور اگر کوئی وفادار کسان چاہے تو اپنے جاگیردار آقا کے لئے تھوڑی سی کاشت بھی کر سکتا ہے۔

9) اندرونی یعنی گھریلو خواتین تمام دن روزے رکھ کے ٹی وی کے سامنے دھوم مچائیں اور بیرونی خواتین بھلے سے وہی کام کرتی رہیں جو وہ کر رہی ہیں۔

10) نوجوان سال بھر ویلنٹائن ڈے کی تیاری کریں ادھیڑ عمر ہوٹلوں میں زندگی بسر کریں اور بوڑھے افراد ہسپتال داخل ہو جائیں۔

ابھی ہمارا یہ سیاسی اصلاحات کا سقراطی فارمولا محو پرواز ہی تھا کہ اچانک ٹی وی پر بریکنگ نیوز آ گئی کہ ہر دلعزیز جنرل مشرف کی وردی پر لگے بعض انمٹ داغوں کو ڈرائی کلین کروانے کا پروگرام سعودی عرب اور چند بڑی نادیدہ طاقتوں کی مرضی سے عدالتی مشین میں ڈال دیا گیا ہے۔ ہمیں اپنے سیاسی فارمولے، شخصی بصیرت اور اصلاحاتی پروگرام کا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا نظر آنے لگ گیا ہے اور انشاء اللہ امریکہ و بھارت اب پاکستان دن چوگنی اور رات سوگنی ترقی کرتے کرتے اس طرح بگٹٹ بھاگتا نظر آئے گا کہ بس پھر اسے گڑگڑا کر اور سر بسجود ہو کر ہی روکا جا سکے گا اور کسی دشمن کی نظر بھی اس کو نہ لگ سکے گی۔

پرویزوں سے شریفوں تک

ہمارے عہد دامادگیٔ سرکار میں ایک بار ایسا موڑ آیا کہ ہمارے محکمے میں سیکرٹری و ڈی جی سمیت بے شمار بشیر پائے جاتے لگ گئے۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک مختلف قسم کے ڈی جی صاحب کا نام شبیر تھا بھلے مانس اتنے تھے کہ ماتحت تک ان کو تین میں اور نہ تیرہ میں شمار کرتے تھے۔ ایک بار محکمانہ میٹنگ میں ان کے پوپلے سے منہ سے دو الفاظ لڑ نکل گئے۔ یعنی انہوں نے غلطی سے رورل کو رولر اور لکھنو کو نکھلو کہہ دیا۔ ہم نے اسی میٹنگ میں موقع پا کر ان کو شبیر کے بجائے بشیر کہہ کر پکارا تو وہ بڑے جز بز ہوئے کچھ نکتہ دان مسکرانے لگ گئے۔ جس پر ہم نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ جناب اگر رورل اور لکھنو ناراض نہیں ہوئے تو آپ بھی براہ مہربانی برا مت مانیے۔ اب یہ خالص ستم ظریفی تھی کہ مسکرانے والے نکتہ دان کھلکھلا کے ہنسنے والے خوشہ چیں بن گئے۔ شبیر صاحب کا سادگی سے شرمندگی کا اظہار کچھ ایسا پیارا سا تھا کہ بس تب سے شبیر صاحب کی ریٹائرمنٹ تک محکمے میں شبیر صاحب بھی بشیر بن کر رہ گئے۔

یہ واقعہ ہمیں موجودہ جمہوری تسلسل میں کئی مقتدر ناموں کی تکرار سے یاد آیا ہے۔ کہ جہاں کئی شریفوں نے کئی پرویزوں کو رخصت کیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ وقت ایک سا نہیں رہتا۔ کیونکہ اس کی بھی عادت 'آدمی سی' ہے۔ قوم بے چاری بھی ہماری طرح ہچکولے کھاتی کبھی پنجہ بشیری سے نکلی تو نظریہ ضروری کی اسیر ہو گئی۔ ہماری جمہوری خاتون کا جنم تو ملک عزیز کے جنم کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ لیکن زمانے کے تھپیڑوں اور شبہائے خون کو سہتی سہتی بلاآخر جوان ہو گئی۔ مگر اس کی جوانی یوں ادھوری ہی رہی کہ کبھی تو اسکو تیرہ شبی ایوبی نے اغوا کر لیا۔ اور کبھی اس نیک پروین کو کسی نیک جرنیل نے اپنے حجلہ عروسی میں دبوچے رکھا۔ نتیجے کے طور پر اس جمہوری خاتون نے ٹینکوں کے اختلاط سے ایک نئی دوغلی نسل جنم دے ڈالی۔ اور پھر پے در پے بے شمار بونے چلبل کرتے پارلیمنٹیرینز جمتی چلی گئی۔ کہ جنہیں دیکھ کر جماعت خواجہ سرا بھی دنگ رہ گئی ہوگی۔ تاریخی لحاظ سے یہ بیچارے خچر کی بدقسمتی ہے کہ تیز رفتار اور مضبوط ہونے کے باوجود نہ گھوڑا اسے اپناتا ہے نہ گدھا۔ لہذا یہ بیچارے پارلیمنٹرین بونے اپنے مشینی باپ اور نظریاتی ماں کی تلاش میں در غیر سے داغ سجدہ لئے لوٹ لوٹ کراتنی بار گھروں کو واپس آئے کہ جتنی بار پارلیمنٹ نہ گئے ہوں گے۔ مگر ایک بات ماننی پڑے گی اور وہ یہ کہ ان ہائبر ڈبونوں میں ایک ایسی زبردست خصوصیت پیدا ہو چکی ہے۔ کہ نہ تو اب ان کو شاہین میزائل موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے اور نہ مسرت شاہین ان میں جذبہ ایمانی ابھار سکتی ہے۔ یعنی نہ ان کو عدالتیں مار سکتی ہیں اور نہ ہی بیچاری عوام انہیں گرم کر سکتی ہے۔

ایک بار چرچل نے اپنی پارلیمنٹ کے اجلاس میں آدھے پارلیمنٹیرینز کو گدھا کہہ ڈالا اس پر اس قدر احتجاج ہوا کہ آخر اسے اپنے الفاظ واپس لیتے ہوئے یہ کہنا پڑا کہ دراصل ہماری پارلیمنٹ میں آدھے ارکان گدھے نہیں ہیں

۔ چرچل ہی کے مصداق ہمارے ہاں حد اس وقت ہوئی جب اس دورنگی ٹینک زدہ مخلوق کو یونیفارم یعنی ایک جیسا بنانے کے لئے پرویزی ڈرون کارخانے میں تربوزی غسل دیا گیا۔ یعنی اندر سے یہ بھلے بندوق کے سامنے سجدہ ریز ہی رہیں مگر باہر سے سب ایک جیسے جمہوری نظر آئیں ۔اس کامیاب پرویزی ڈرون حملے نے ہمارے سابقہ محکمے کے بشیروں کی طرح بے شمار پرویز پیدا کردیئے۔ نئی صدی کے آغاز سے ہی میثاق جمہوریت میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ ان ٹینکراددوں کو چونکہ کامیابی سے جمہوری تربوز بنایا جا چکا ہے۔اس لئے آئندہ سے یہ آپس ہی کے اختلاط سے کیچوئے کی طرح نسل بڑھاتے چلے جائیں اور پارلیمنٹ میں مستقلاً قیام کریں۔ تاکہ پارلیمنٹ کو وقتاً فوقتاً بارودی توڑپھوڑ سے بچایا جا سکے۔ بہر حال نتیجہ اچھا نکلا ہے۔ یعنی ہماری وہ پارلیمنٹ جو کبھی ان پڑھ تھی اب گریجوئٹ ہوگئی ہے۔ کبھی پرویزی تھی اب شریف ہوگئی ہے۔ کبھی برسوں تک چھٹیوں پر چلی جاتی تھی۔ لیکن اب وہ پہیے کی طرح مسلسل چلتی اور چمکتی رہے گی۔ رہ گئی بھلی مانس عوام تو وہ جائے بھاڑ میں۔ ہاں اگر عوام کو بھی سٹیٹ بنک سے روزانہ چھپنے والے کڑکڑاتے نوٹوں کی خواہش ہے یا بیرون ملک جزیرے خریدنے کی طمع ہے یا پھر سستی گولی کی بجائے سستی روٹی کھانے کا لالچ ہے۔تو وہ بھی پرویزی حیلے چھوڑ کر جلد از جلد شریفی وطیرے اختیار کر لے۔ یہ تو اس کی نیت، اہلیت اور ہمت پر منی ہے۔ یعنی ملک میں گردش کرتی دولت کا بہاؤ پارلیمنٹ کی طرف رواں دواں رکھنے کے لئے خون اپنے بدن کا بچے اور پانی بھی اپنے کنوئیں کا بچے۔ سفر وحضر کت لئے اپنی ہی ٹانگوں پر بھروسہ رکھے رہائش کے لئے کسی بھی سایہ دار درخت کا انتخاب کرے لیکن ووٹ ہر صورت اسی جمہوریت کی موجد دونوں پارٹیوں کو دیتی رہے۔ اگر ووٹ نہ بھی دے سکے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ سوڈیڑھ سو اضلاع کے ہزاروں پٹواری بھلا کس لئے ملازم رکھ چھوڑے ہیں۔ ووٹ بنانا اور ڈالنا انکا کام ہے۔{اللہ اللہ خیر سلا}

ای روٹی

سن انیس سواسی کی دہائی میں امریکن یونیورسٹیوں سے ہمارے خط کا جواب تین سے چار ہفتے بعد آتا تھا۔اس سے اٹھنے والے سوالات اور پھر ان کے جوابات کا سلسلہ مہینوں چلتا رہتا تھا۔اسی دہائی کے آخر میں یورپ سے ہم نے جب پہلی ای میل پولینڈ سے سکاٹ لینڈ بھیجی اور شام ڈھلنے تک تین چار بار پیغامات کا تبادلہ بھی ہو گیا۔تو ہم ایک خوش کن حیرت میں ڈوب گئے اور اپنے آپ کو تمام پاکستانیوں سے ایڈوانس سمجھنے لگ گئے۔حیرت دراصل یہ تھی کہ کس طرح سوفٹ کاپی نے ہارڈ کاپی کی جگہ لے لی ہے اور نہ انتظار نہ خرچہ۔پچھلے چند برسوں سے ہمارے ایک ساتھی بھی ای کامرس اور ای بزنس میں چلے گئے ہیں۔اور سارا دن گھر میں پڑے پڑے بزنس اور رومانس کرتے رہتے ہیں۔اس سے ہمیں ایک آئیڈیا آیا ہے۔کہ ہم بھی اپنے تقریباً سبھی مسائل کو 'ای یعنی الیکٹرانک رنگ دے کر بے شمار دلدروں سے آزاد ہو سکتے ہیں۔مثلاً نوع انسانی کی بنیادی ضرورت روٹی کو بھی اگر 'ای روٹی' کی شکل دے دی جائے تو تصور کریں کہ زندگی کتنی آسان ہو جائے گی۔اور رنگ ڈھنگ ہی بدل جائیں گے۔آیئے ذرا چشم تصور سے دیکھیں کہ روٹی کے الیکٹرونک ہوتے ہی ہمارا رہن سہن کیسا ہو جائے گا؟

تب گھروں میں خواتین سارا دن باورچی خانے کی بجائے ڈرائنگ روم کی زینت بنی رہا کریں گی۔اور روٹی ٹکر کی جانگسل محنت کرنے کی بجائے خاوندوں کو مہیب قسم کے کوسنے دینے میں حسب توفیق ذرا زیادہ وقت دے پائیں گی۔مزدور طبقہ روٹی کمانے کی بجائے بٹیر لڑانے کے لئے وقت نکال سکے گا۔سستی روٹی پراجیکٹ اپنے سے بھی سستی ای روٹی دیکھ کر بھنا جائے گا۔اور سستے تندور کی پلاننگ کرنے والے تمام محب وطن سیاسی دانشوروں کو صبح دوپہر شام سو سو کوسنے دینے پر تل جائے گا۔آٹا گوندھتے ہوئے ہلنے والی چالباز خواتین اب بغیر پلک جھپکائے ٹی وی دیکھتے ہوئے جھوم سکیں گی۔لیکن ہو سکتا ہے کہ ٹی وی پر فلم وغیرہ چل ہی نہ پائے۔کیونکہ قوم کا سرمایہ یعنی فنکار اب محض روٹی کمانے کے لئے نہ تو بے سروپا تھرکیں گے اور نہ اسنکر پرسن بن کر بے پر کی اڑائیں گے۔اب تو صورتحال کچھ گڑبڑ ہو جائے گی کہ۔

ای روٹی کی آمد سے ہو گیا قصہ تمام وگرنہ ان شریفوں کو بے زباں سمجھا تھا میں

ای روٹی کا تصور کمرشل دانشوروں کے لئے البتہ خاصہ روح افزا ہو گا۔کیونکہ روٹی پانی کے چکر میں تعلیم حاصل کرنے والے 'جہلاء' کا تقریباً خاتمہ ہو جائے گا۔اور پھر دانشوروں کو اپنے نام کے ساتھ ڈگری خرید کر ڈاکٹر نہیں لکھنا پڑے گا۔جونہی روٹی کمانے کی فکر ختم ہو گی۔تو پھر بھلا فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام کرنا کون پسند کرے گا۔کھیتوں میں بھی ہل چلانے کی بجائے پتنگ بازی چلنے لگ جائے گی۔مارکیٹوں میں گاہک بھلا کس کے پاس جائیں گے؟ کیونکہ دوکاندار تو روٹی کے چکر سے آزاد ہو جانے کے باعث شٹر ڈاون کئے رکھیں گے۔ہمارے گمان کے مطابق

سب سے زیادہ فائدہ حکومت کو ہوگا۔ کیونکہ اسکی جان ان خواہ مخواہ قسم کے محکموں سے چھوٹ جائے گی۔جن کی وزارتیں بانٹنے کے لیے انہیں بلیک میل ہونا پڑتا ہے۔نہ محکمے ہوں گے اور نہ منہ زور بیورکریسی کو محنت کرنا پڑے گی۔ نہ سفارت وزارت کے ولدر۔اور نہ مولانا فضل الالرحمان کی بے چینیاں۔البتہ ایک طبقہ ایسا ضرور ہوگا جو سخت نقصان میں رہے گا۔ اور وہ ہے موبائل انٹرنیٹ اور فیس بک کے صارفین۔یعنی پاکستان کے بارہ کروڑ غیور انٹرنیٹ عوام۔بے چارے نہ روزانہ سینکڑوں ایس ایم ایس کر پائیں گے۔اور نہ موبائل پر گرل اور بوائے فرینڈز کو ساری رات سب کہہ سکیں گے۔اور نہ ہی آنٹیاں فیس بک پر پوتوں اور نواسوں کے پیمپر ز کی تصویریں اپ لوڈ کر سکیں گی۔بھلا یہ طبقہ اس دانشورانہ مصروفیت سے کیسے محروم رہے گا؟ وجہ صاف ظاہر ہے کہ موبائل کمپنیوں،انٹرنیٹ اور فیس بک کو بھی چونکہ روٹی کمانے کی فکر نہیں ہوگی تو پھر بھلا وہ اپنا کاروبار کیوں پھیلائیں گی؟

ایک سوال البتہ ابھی تک ہمیں بھی اور قارئین کو بھی تنگ کئے جا رہا ہے۔اور وہ یہ کہ اس موئی ای روٹی سے ہمارا پیٹ کیسے بھرے گا؟اور اگر بھر بھی جائے تو تن پر کپڑا،سر پر چھت اور آنکھ میں ٹی وی کی ضرورت تو رہے گی۔تو آیئے ڈاکٹر خطائی سے ان سوالات کے جوابات کچھ مزید سوالات کے جوابات میں سے پوچھتے ہیں۔مثلاً کیا جو نسل کبوتر کے ساتھ رقعہ باندھ کے بھیجتی تھی وہ آج کی ای میل کا سوچ سکتی تھی؟ کیا دشمن کو مارنے کے لئے پہلے پہل جس نے بارود پھوڑا تھا وہ بغیر پائلٹ کے ڈرون حملے کا تصور کر سکتا تھا؟ کیا انیسوی صدی میں طویل سفر کر کے سالہا سال لنکنز ان یونیورسٹی سے بار ایٹ لاء کرنے والے قائداعظم سوچ سکتے تھے کہ اکیسوی صدی میں گھر بیٹھے بیٹھے لاء کی ڈگری خرید کر بھی ڈاکٹر بنا جا سکتا ہے؟ بلکہ وزیر قانون بھی بنا جا سکتا ہے۔کیا مجنوں کے دماغ کے کسی بھی کونے میں یہ ترکیب موجود تھی کہ سنگلاخ پہاڑوں کو عبور کر کے لیلیٰ کو ڈھونڈنے کی بجائے محبوبہ کو گھر بیٹھے انٹرنیٹ پر بھی تلاش کر کے شادی کی جا سکتی ہے؟ یقیناً نہیں۔بالکل اسی طرح ہماری نانیوں دادیوں کے وہم بھی نہ تھا کہ سارا دن گرمی میں چولہوں کے سامنے بیٹھ کر ہانڈی روٹی کرنے کی بجائے محض ایک فون کال پر ای روٹی کی ہوم ڈلیوری کرائی جا سکتی ہے؟ اور یہ ہے وہ ای روٹی میں راز۔ جس کا تصور خادم اعلیٰ بھی نہیں کر سکے تھے۔تبھی تو انہوں نے اربوں روپے کی سستی روٹی بنا ڈالی ہے۔اب بھی وقت ہے کہ ہم سے مشورہ کر لیا جائے کہ جاہل عوام میں زیادہ سے زیادہ مقبول بننے کے لیے اور کون کون سے روٹی ڈرامے کیے جا سکتے ہیں؟۔

اصلی ڈاکٹر معالج نہیں ہوتا

شاید اسے آپ لطیفہ سمجھیں۔مگر سچی مچی ہمارے کوئٹہ کے ایک پڑوسی ڈاکٹر حسین صاحب نے ہمیں ایک بار اپنا واقعہ سنایا کہ ایک رات محلے دار غریب عورت نے ان کی خوب بے عزتی کر دی۔دراصل موصوفہ اپنی بیمار بچی کو اُٹھائے ڈاکٹر حسین سے علاج کرانے کی غرض سے ان کی منت سماجت کرتی رہی۔جب زچ ہو کر ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ بی بی میں معالج نہیں ہوں۔ بلکہ امریکہ سے زراعت کے شعبے میں آلوؤں پر تحقیق کر کے آیا ہوں تو وہ مشتعل ہو گئی۔ اور انتہائی بدلحاظی سے بولی کہ چلو تم میری بچی کا علاج نہیں کرنا چاہتے تو نہ کرو۔مگر بھلا کوئی آلوؤں کا بھی ڈاکٹر ہوا ہے کبھی؟غلطی دراصل ہمارے دوست کی تھی جو شیخی میں آکر دروازے پر اپنے نام کی تختی پر ڈاکٹر لکھ بیٹھے تھے۔

چلیے یہ تو ایک ان پڑھ عورت کا انتقام تھا۔ہم تو اس بات کے بھی گواہ ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی کے ایک آفس سپر ٹینڈنٹ نے ہمارے عزیز محترمی دوست ڈاکٹر چیمہ صاحب کی برطانیہ سے حاصل شدہ ڈگری اس اعتراض کے ساتھ واپس کر دی کہ آپ تو زوالوجی میں ڈگری لینے گئے تھے تو یہ فلسفے (ڈاکٹر آف فلاسفی) میں کیوں لے کر آ گئے۔ دراصل مذکورہ قسم کے دونوں اصلی ڈاکٹر عمومی معاشرے کے لیے بے کار ہوتے ہیں۔کیوں کہ وہ مریض کی تندرستی کے لیے نہ تو آپریشن کر سکتے ہیں، نہ ٹیکہ لگا سکتے ہیں اور نہ ختنے۔عوام کو تو ان ڈاکٹروں کی ضرورت ہے۔جو کلینک یا ہسپتال میں آئے مریض کو فوراً تندرست کر دے۔ بھلے سے ساتھ میں مفلوک الحال بھی کر دے۔کیونکہ مقصد تو صحت کی ترسیل ہے علم کی نہیں۔یعنی ہمیں دراصل معالج کی ضرورت ہے نہ کہ اصلی ڈاکٹر کی بھلے سے وہ معالج پچاس ہزار آبادی والے گاؤں میں وہ ایک لاکھ ختنے ہی کیوں نہ کر چکا ہو۔بالکل ایسے ہی جیسے طاقتور سیاستدان کے بیلٹ بکس سے آبادی سے بھی زیادہ ووٹ نکل آتے ہیں۔حالانکہ عوام نے انتخابات کا بائیکاٹ کر رکھا ہوتا ہے۔مخالفین جب اس الیکشنی لطیفے پر احتجاج کرتے ہیں تو یقین کریں ہمیں ان کی روحانی پُراعتمادی پر بے حد غصہ آتا ہے کہ شریف آدمیو کیا تمہیں فرشتوں کی موجودگی پر یقین نہیں ہے؟

اپنے پیارے وزیراعظم نواز شریف کو ڈاکٹر بننے پر بھرپور مبارکباد ہو۔یقین کریں ان کے اس اعزاز کو ان کی یونیورسٹی سے بھی پہلے ہم نے تسلیم کیا ہے۔کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر نواز شریف کا ارادہ بھی چونکہ قوم کا علاج کرنے کا نہیں ہے۔لہذا انہوں نے درست طور پر اعزازی ڈگری قبول کی ہے۔اب وہ علم کی ایک باکمال ڈگری کے حامل ہو چکے ہیں۔اور ایک اعزازی ڈگری کے سچے اور واحد حقدار قرار پائے ہیں۔حضرت علامہ ڈاکٹر شیخ الاسلام جناب طاہر القادری صاحب بھی اپنی ہی یونیورسٹی سے اس اعزاز کے لیے واحد اور قابل امیدوار تھے۔مگر وہ تو علم کی تاب نہ لاتے ہوئے یورپ جا چھپے۔ ہمارے شیر کو تو علم کی پیاس سعودی عرب سے کھینچ کر پاکستان لے آئی ہے۔ یہ ایک

اعزازی ڈگری ہے۔ نہ تو سیاسی ڈگری ہے اور نہ مصنوعی اور جعلی۔ کیونکہ اس ڈگری کو دینے کے لیے برصغیر کی اعلیٰ ترین اور قدیم ترین درسگاہ پنجاب یونیورسٹی کے خصوصی طور پر امپورٹڈ چانسلر صاحب نے بھری دنیا کے سامنے اپنے مبارک ہاتھوں سے پیش فرمائی ہے۔ جسے انتہائی عاجزی سے جناب ڈاکٹر نواز شریف صاحب نے اتنے تقدس سے قبول فرمایا ہے کہ جلاپے میں مبتلا آدھی دنیا اس بات پر حیران اور پریشان نظر آتی رہی کہ محض اتنے سے کام کے لیے جناب ڈاکٹر نواز شریف کو کتنے ہی چلّے کاٹنے کے بعد بادل نخواستہ تیسری بار وزیراعظم بننا پڑا۔ رقیبوں کے خبثِ باطن کو تو ہم دبا نہیں سکتے۔ لیکن ہمیں کوئی پندرہ برس پرانے ایک نشے والے ڈاکٹر صاحب کا مشورہ یاد آ گیا۔ جو انہوں نے اپنی ساتھی ڈاکٹر کو ان دنوں میں دیا جب کینیڈا نے پاکستانیوں کو ویزے جاری کرنے پر خاصی سختی کر رکھی تھی۔ محترمہ نے ڈاکٹر صاحب سے کینیڈین ویزہ حاصل کرنے کا طریقہ پوچھا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ پہلے امریکن ویزہ اپلائی کرو، اگر مل گیا تو پھر یقیناً کینیڈا کا ویزہ بھی مل جائے گا۔ خیر وہ ڈاکٹر محترمہ تو بیچاری دونوں ویزے گنوا بیٹھی۔ لیکن اللہ نے ہمارے قائد کو حاسدوں کی نظرِ بد سے دور رکھا اور سلیمانی ٹوپی پہن کر ہمارے دانشور ڈاکٹر وزیراعظم دونوں اعزاز لے اڑے ہیں۔ ان کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایک بار پھر سے مبارک ہو۔

اللہ نہ کرے کہ ڈاکٹر نواز شریف صاحب کے ساتھ بھی کوئٹہ والے ڈاکٹر حسین والا واقعہ رونما ہو پائے اور موئی مڑھال ملکی معیشت کہیں رات کے وقت ان کے محل کی زنجیر ہلا کر یہ مطالبہ نہ کر بیٹھے کہ ڈاکٹر صاحب میں آخری سانسوں پر ہوں جلدی سے کسی زندگی بچانے والی دوا کا انجکشن لگائیں۔ اور اُن کو خام کم بدھن یہ صفائی نہ دینی پڑ جائے کہ یہ تو بچا سرور چوہدری کی ضد سے مجھے سیاسی پی ایچ ڈی ملی ہے وگرنہ میں تو محض میٹرک کی سند پر بھی خوش تھا۔ ان پڑھ معیشت کا کیا بھروسہ ہے کہ وہ بھی اس ان پڑھ عورت کی طرح طنزاً مسکراہٹ سے یہ نہ کہہ بیٹھے کہ جناب اگر آپ میری عزت اور زندگی نہیں بچانا چاہتے تو نہ بچائیں۔ مگر انسان مصنوعی بالوں یا مصنوعی دانتوں والا تو ہو سکتا ہے بھلا کوئی مصنوعی ڈگری والا بھی ہوا ہے کبھی؟ نصیب دشمناں ایسی بُری گھڑی آنے سے قبل ہی ڈاکٹر نواز شریف صاحب کو ہمارا مشورہ ہے کہ چپکے سے اب جلد از جلد کسی ڈگری فروش سے رابطہ کر کے چند سو ڈالروں کے عوض سری لنکا سے پی ایچ ڈی کی ڈگری منگوا کر سنبھال رکھیں۔ تا کہ سالہا سال تک شب و روز محنت سے ڈاکٹر بننے والوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کو شرمندہ کر سکیں۔ تھیسیس یا مقالہ لکھنے کے لیے بھی اگر مزید چند سو ڈالر کی سرمایہ کاری پر راضی ہو جائیں تو ان کو ایک ایسے میڈیکل ڈاکٹر کا پتہ ہم بتا دیتے ہیں جو بنے بنائے مقالے پر باقاعدہ طور پر غیر ملک سے ڈگری جاری کرانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ کچھ رقیب روسیاہ اس پر بھی اعتراض لگا دیں کہ ایسی ڈگری بھی تو جعلی تصور ہو گی۔ کیونکہ حقیقت میں نہ تو لیکچر لئے نہ تحقیق کی اور نہ مقالہ لکھنے میں عرق ریزی ہوئی۔ ایسے بدخواہوں کے لیے پیشگی عرض ہے کہ اگر آپ نے کسی بھی اعزازی پی ایچ ڈی ہولڈر کو جعلی ڈگری والا کہا۔ تو یقین کریں کہ ہم ڈاکٹر بابر اعوان کو اپنا وکیل مقرر کر کے عدالتوں کے اندر آپ کو ایسا رگڑا لگائیں گے کہ آپ اپنی وصیت میں بھی لکھ کر جائیں گے۔ کہ خبردار آئندہ سے میری آنے والی نسلوں میں سے کوئی بھی یونیورسٹی یا کالج گیا۔ بس کسی فوٹو کاپی والے سے کمپیوٹر کے ذریعے رنگین سند

نکلوا کر مناسب داموں پر خرید لیا کریں۔ اور اپنے دانت کھٹے ہونے سے پہلے پہلے دوسروں کے دانت کھٹے کر دیا کریں۔

جب ہم یہ سطریں لکھ رہے تھے تو ہمارے دیرینہ دوست ڈاکٹر خطائی تشریف لے آئے۔ خود ایم بی بی ایس ہیں۔ لیکن اپنے پیشے پر بھی تنقید سے باز نہ آپاتے۔ ہمیں مطلع کرتے ہیں کہ جناب جب تک کسی کی ڈگری میں لفظ 'ڈاکٹر' نہ لکھا ہو وہ ڈاکٹر نہیں کہلا سکتا ہمارے سمیت۔ اب ہم ڈاکٹر خطائی کو کیا بتائیں کہ اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنے کا مرض اتنا عام اور پرانا ہے۔ کہ اب تو جانوروں کے علاج معالجہ کرنے والے سادہ سے گریجویٹ کی ڈگری کے اندر بھی ڈاکٹر لکھا ہوتا ہے۔ اور وہ ڈی وی ایم کی ڈگری لیتے ہی قانونی طور پر ڈاکٹر بن جاتا ہے۔ حالانکہ ابھی بے چارے نے نہ ماسٹر کیا ہوتا ہے اور نہ اصلی ڈاکٹری کے رگڑے کھائے ہوتے ہیں۔ ہمارے چہرے کے اُتار چڑھاؤ اور خشمگین نظروں سے ڈاکٹر خطائی نے ہمارے خیالات جانچ لئے۔ بس وہ چپ ہو لیے اور ازاں بعد ہم دونوں احمق چائے کے کپ پر اس نکتے پر متفق ہو گئے۔ کہ اگر حکیم بی ای ایم ایس کر کے ڈاکٹر کہلوا سکتا ہے۔ بلکہ ہومیو پیتھک بھی اپنے آپ کو ڈاکٹر کہہ سکتا ہے یا ستم بالائے ستم انسانی وحیوانی کلینک پر کام کرنے والے کمپاونڈر بھی اپنے آپ کو ڈاکٹر کہہ سکتے ہیں۔ تو چشم بد دور ہمارے خوبصورت اور چمکدار تیسری بار کے وزیراعظم پنجاب یونیورسٹی کی اصلی ڈگری کا اعزاز حاصل کر کے اپنے آپ کو ڈاکٹر نواز شریف کیوں نہیں کہ سکتے ؟ یا ڈاکٹر والی نیم پلیٹ اپنے رہائشی اور دفتری محلات کے باہر کیوں نصب نہیں کر سکتے ؟ ہم تو آرمی چیف، چیف جسٹس، نیز ہر طاقتور شخص کو اصلی ڈاکٹر دیکھنے کے متمنی ہیں۔ جلنے والے کا منہ کالا۔

برانڈ ڈچڈی

ہمیں اپنے بچپن کا ایک دوست کے ساتھ پیش آنے والا وہ واقعہ ابھی تک یاد ہے۔ ہوا یوں کہ ان کے ابا نے صبح کسی اہم تاریخ پر جج کے سامنے پیش ہونا تھا۔ وہ جلدی سے لنڈے سے ایک پتلون خرید لائے جو دو انچ لمبی ملی۔ انہوں نے آتے ہی بیٹے کی ڈیوٹی لگادی کہ درزی سے دو انچ چھوٹی کروا لاؤ۔ جو وہ کروالایا اور کھونٹی پر لٹکا دی۔ شام کے وقت جب بیٹا نظر نہ آیا تو اماں حضور نے بیٹے کو لاپرواہی پر صلاواتیں سناتے ہوئے مشین پکڑی اور پتلون دو انچ چھوٹی کر کے لٹکا دی۔ رات سونے سے قبل بڑی بیٹی کو ابا کا حکم یاد آیا تو وہ بھی حکم بجا لائیں اور پتلون دو انچ چھوٹی کر کے کھونٹی پر لٹکا دی۔ قصہ مختصر چھوٹی بیٹی نے بھی اپنا فرض ادا کر دیا کہ شاید بھیا بھول گئے ہونگے۔ بس جب صبح ابا حضور نے چڈی نما پتلون پہنی تو خوشی سے پھولے نہ سمائے کیوں کہ وہ اس اولین چڈی کے موجد قرار پا گئے جسے آجکل شاید شارٹس کہتے ہیں۔

یہ شارٹس یا برمودا شارٹس بھی کمال چیز ہے۔ اس کے ساتھ اگر جاگر پہن لیں تو امریکن اور بے فکرے بن جائیں۔ اور اگر چپل پہن لیں تو محض لُفرے ہی لگیں کہ جن کو ٹانگیں ڈھانپنے کے لیے چند گرہ کپڑا میسر نہ رہا ہو۔ چند سال قبل جھنگ کی مشہور انٹرنیشنل برانڈ کی جین بنانے والوں نے ہمیں تحفتاً برمودا شارٹس بھیجے۔ موسم چونکہ گرم تھا تو ہم چند بار ہی اسے زیب لات کر کے کالونی کی سیر کو نکلے ہوں گے۔ کہ ہم نے اپنے کانوں سے گارڈز کو آپس میں گفتگو کرتے سنا کہ اچھا یہاں ڈاکٹر صاحب کا گھر ہے جو چڈی پہن کر گھومتے ہیں۔ ہم نے جب اپنی برانڈڈ شارٹس کی یہ توہین ہوتی دیکھی تو فوراً سے پہننا بند کر دیا۔ لیکن اس برانڈڈ شارٹس کا ذرا کمال دیکھیں کہ وہ تو مزے سے الماری میں استراحت فرما رہی ہے۔ لیکن ہمارا نام اب بھی برانڈڈ چڈی والا مشہور ہے۔ ہم اب بھی اس الجھن میں گرفتار ہیں کہ اس طرح کے جملے کسنے سے ہماری توہین ہوئی یا کہ برانڈڈ چڈی بنانے والوں کی۔

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ شارٹس بھی کوئی جادو کی چیز ہے۔ اگر کوئی اسے اپنی زندگی پر لاگو کر لے تو اس کے اتنے فائدے ہیں کہ جتنے کلونجی کھانے کے بھی نہیں ہوں گے۔ بیشک یہ شارٹس ہماری بدنامی کا باعث بن گئی ہے۔ لیکن ہمیں اس کی افادیت کا تب اندازہ ہوا جب ہم یورپ ڈاکٹریٹ کرنے گئے تو وہاں ایک چشتی صاحب کی شارٹس بلکہ لائف شارٹس کو خاصہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہر چند کہ ہم سمجھتے رہے کہ یہ ننھے میاں گریجوایشن کرنے آئے ہیں۔ لیکن انہوں نے ایسا شارٹ کٹ مارا کہ انیس ماہ میں وہ پی ایچ ڈی لے بھاگے جو ہم بمشکل باون ماہ میں کر پائے۔ دراصل وہ اپنی امی ہی کے سکول میں پڑھے تھے جنہوں نے میٹرک تک ان کو دو سال کا شارٹ کٹ لگوا دیا تھا۔ ابا ایک پہنچے ہوئے پیر باتدبیر تھے۔ لہذا کسی عقیدت مند نے یونیورسٹی میں لیکچرار کی جاب لے دی۔ لہذا اب وہ زندگی

میں شارٹ کٹ لگانے میں اتنے طاق ہو چکے تھے کہ سچ پرست یوروپینز کو ٹھوک لگا کر ڈاکٹریٹ کے شارٹس پہن کر امریکہ جا دھمکے۔

ایک سرکاری قسم کے بھی برموودا شارٹس ہیں۔ جو غالباً برانڈ ڈچڈی کی سب سے اعلیٰ مثال ہے۔ اور وہ ہے سول سروس کا امتحان پاس کر کے جلدی جلدی میں گرما گرم حلوہ کھاتے چلے جانا اور وہ بھی اس انداز میں کہ منہ اور دل صرف ماتحتوں کا جلے۔ وہ کالے انگریز کی شکل میں قابل بیوقوفوں کے خون سے اپنے طاقتور مستقبل کا دیا جلاتے چلے جاتے ہیں اور ہر دو سال بعد باریاں بدل بدل کر شارٹس چینج کرتے رہتے ہیں۔ مگر اس طرح کہ محنت تو ماتحت ہی کرتے رہیں لیکن ان کا برانڈ امپورٹڈ ہی رہے۔ ہماری سیکرٹریٹ والی چاکری میں اس طرح کے کئی چھوٹے میاں بڑا سامنہ کھول کر اپنا پیٹ بھرتے رہے۔ ہم نے کئی بار اپنے وقت کا خون کر کے ان کی حکومت میں رنگ بھرے۔ لیکن جس روز اپنی افتادِ طبع کے باعث ان کو نظر انداز کیا اُسی روز گھر جا بیٹھے۔ ایک بار تو بڑا مزہ آیا۔ ہمارے ہی ہاتھوں سے بنی یونیورسٹی میں پروفیسری کی نوکری سے صرف اس لیے جواب مل گیا۔ کہ وہاں پر بے شمار برانڈ ڈچڈیوں نے مافیا بنا لیا تھا۔ اس گروہ میں جگہ یا تو کسی جرنیل کے گن مین کی سفارش کی بنا پر مل سکتی تھی یعنی توپ مار کہ شارٹس پہننے لازم تھے۔ یا پھر ان بونے عالموں کو خوشامدی چاشنی والی چڈی صبح شام سپلائی کرتے رہنے کے بل بوتے پر۔ ہم جب وہاں سے الٹے پاؤں بھاگے تو برطانوی حکومت نے ہم پر ترس کھا کر ایک خاص قسم کی سکیم نکالی۔ تاکہ ان کو انتہائی سستے داموں ہماری قسم کے درجہ چہارم کے ایسے ناراض غلام مل جائیں جو اپنی مادرِ وطن سے درجہ دوم یا سوم کے شہری ہونے کے باعث شاکی رہتے ہوں۔ ہم جب اس سکیم سے فائدہ اُٹھانے وہاں پہنچے تو دل سہم کر پھر سے بکری بن گیا۔ کیوں کہ یہاں بھی ہمارے ہاں والے برانڈ ڈچڈی والوں کا طوطی بول رہا تھا۔ چونکہ شارٹ کٹ دماغ سب سے زیادہ کام کرتا ہے۔ اس لیے اس سکیم سے بھی اسی فیصد فائدہ برموودا شارٹس یا برانڈ ڈچڈی والوں نے ہی اُٹھایا ہوا تھا۔ جعلی دستاویزات بنانے والے باقاعدہ دفاتر کل گئے تھے اور ان دفتروں کے باہر نیز بیتھرو ائیر پورٹ کے اندر بے شمار سانولے کلوٹے برانڈ ڈچڈیاں پہن کر اپنی باری کے انتظار میں کھڑے رہتے تھے۔ جنھوں نے برطانوی حکومت کو کاغذی محاذ پر اتنا زچ کیا کہ اُسے با دلِ نخواستہ ان ہی کو برطانوی شہری ماننا پڑا۔

جب ہم نے ہر محاذ پر اپنی لانگ کٹ لنگی کو برانڈ ڈچڈیوں سے پے در پے شکست کھاتے دیکھا تو مشورہ لینے بڑے ادب سے اپنے قدر دان ڈاکٹر خطائی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ انہوں نے ہماری یتوپین سوچ کے مدنظر ایک مشہور مشاورتی انجینئرنگ کمپنی میں بطور مشیر کام کرنے کا مشورہ صرف اس بنا پر دے ڈالا کہ موصوفہ کمپنی کا بڑا نام تھا۔ اور اس کے اندر آدھے مختی بوڑھے انجینئرز اور باقیماندہ نوجوان بھی مسلمان ہونے کے باوجود حیرانگی کی حد تک مختی تھے۔ ابھی ہمیں یہاں چھ ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک روز اندر ہی کے ایک انجینئر نے مرکزی حکومت سے مک مکا کر کے برانڈ ڈچڈی پہنی اور ایم ڈی بن بیٹھے۔ وہ مرکز کے برموودا شارٹس کے نہ صرف منظورِ نظر تھے بلکہ مخالفین کو کراچی طرز پر بوری بند کرنے کی صلاحیت سے بھی مالا مال تھے۔ ہم نے وہاں بڑے بڑوں کو اپنی گنہگار آنکھوں سے چھوٹی چھوٹی حرکتیں کرتے دیکھا۔ لانگ کٹ لنگیوں کے دعویداروں کو بھی برانڈ ڈچڈیاں پہنے ان کے ارد گرد رقص کرتے دیکھا۔ اب

ہمیں اپنی افتادِ طبع پر بڑا غصہ آتا ہے۔ کہ ہم بظاہر تو برانڈ ڈچڈی والے مشہور ہیں لیکن اندرونِ خانہ حالت یہ ہے کہ اپنی لانگ کٹ لنگی کو بھی زور سے یوں تھام رکھا ہے کہ مبادا گرفت ڈھیلی ہوتے ہی یہ بھی برانڈ ڈچڈی نہ بن جائے۔

تربیت بالغاں

عالمی ٹرینر حسنین جاوید نے ہمیں پہلی بار کلاس روم میں دیکھ کر غالباً یہ سوچا ہوگا کہ یہ صاحب کہیں غلطی سے ہمارے ٹریننگ ہال کو تعلیم بالغاں کی کلاس سمجھ کر تو نہیں آ گئے ہیں۔ یا پھر یہ سوچا ہوگا کہ اگر انہوں نے درجنوں پراجیکٹس کا تجربہ نچوڑ کر پی رکھا ہے۔ تو پھر یہاں یہ اب لینے آئے ہیں؟ اگر حقیقتاً انہوں نے ایسا ہی سوچا تھا تو ہمیں حسین موسم کی وساطت سے اپنے قیام یورپ کا ایک واقعہ یاد آ گیا ہے۔ ایک مرد عورت اور چار بچوں والی فیملی چرچ میں داخل ہوتی ہے۔ اور دونوں عورت مرد پادری سے نکاح پڑھانے کی درخواست کرتے ہیں۔ پادری صاحب چونک کر پوچھتے ہیں کہ یہ جو چار بچے ساتھ ہیں کیا یہ جہیز میں ملے ہیں یا یہ آپ دونوں کی سابقہ شادیوں کا انجام ہیں؟ دونوں مجنوں جواب دیتے ہیں کہ نہیں نہیں پاپا۔ یہ ہمارے ہی ہیں لیکن اب ہماری انڈرسٹینڈ نگ ہوگئی ہے۔ بس ہم نے اب فیصلہ کیا ہے کہ شادی کر ہی لیں۔ وہ فیملی تو چرچ میں شائد واقعی آم لینے گئی ہوگی۔ لیکن ہم بہر حال پراجیکٹ مینجمنٹ کی مذکورہ ٹریننگ میں کسی اور مقصد کے لئے گئے تھے۔

اب بھلا ہم بچیلے حسنین صاحب کو دربدر ٹریننگیں لینے کی وجہ کس منہ سے بتلاتے کہ ہم نہ تو علم حاصل کرنے کے اس طرح سے شوقین ہیں۔ جس طرح ہماری اکلوتی بیگم گول گپے کھانے کے شوق میں چین تک جانے کو تیار رہتی ہیں۔ اور نہ ہی ہمیں ڈگریوں اور سندوں کا طوق گلے میں اس طرح ڈلوانے کی ہوس ہے۔ جس طرح منیر نیازی نے گلے میں غموں کا طوق لٹکائے رکھا تھا۔ بلکہ ہماری تو منزل بھارتی گلوکار 'اُدت نارائن' کے بقول کچھ اور ہے۔ حالانکہ اس کے پاپا کہتے تھے کہ یہ بہت نام کرے گا۔ اور اُن کا بیٹا کچھ ایسا کام کرے گا کہ دنیا دنگ رہ جائے گی۔ لیکن اس بندے نے تو کوئی خوبصورت سا کام یعنی عشق کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ بس ہمارے اور اُدت نارائن کی مشترکہ مہم جوئی کا نیک مقصد بھی محض ایک ہی رہا ہے کہ ہم اس لیے ان ٹریننگوں کے نال نال رہتے ہیں کہ شاید ہمیں بھی کوئی ہینارا اپنے ہان دی کہیں مل جائے۔ بقول سرور سلطان:

خورے کتھے مینوں مل جاویں ہر چہرے تے جھاتی پاواں
تیرے عشق دیاں سوغاتاں ٹک ٹک اتھرو لمیاں ہاواں

ہمارا اس قدر بھونڈا مقصد جان کر یقیناً اس کورس میں ہمارے دیگر ہم نشینوں کو سخت مایوسی ہوئی ہوگی۔ کہ دیکھو یہ حضرت شکل سے کتنے سنجیدہ لگتے ہیں۔ مگر اندر سے نرے ٹھرکی نکلے۔ لاحول ولاقوۃ۔ شکل مومناں کرتوت کافراں۔ واللہ کوئی ہماری بھی تو سنتا کہ ایسا ہرگز نہیں۔ ہم زمانہ جدید کے مسلمان ہیں۔ ہم تو خراب کام کرنے کی بجائے محض ہر وقت نیت خراب رکھتے ہیں کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ محض نیت خراب کر لینے سے گنا تھوڑی ملتا ہے؟ جب تک کہ اس گناہ کی

لذت حاصل نہ کرلی جائے۔اور رہی بات گناہ کی لذت کی۔تو وہ محض پاکئ داماں کی داستان ہے۔اور دردِ جگر کے علاج کے قصے ہیں۔وگرنہ ساری عمر تو ہماری عشق کرنے کی خواہش ہی رہی ہے۔لیکن آخر میں ہاتھ میں محض ٹریننگ کا سرٹیفکیٹ ہی آتا ہے۔بقول شاعر۔

تا عمر ڈھونڈتا رہا منزل میں عشق کی　　　　انجام یہ کہ گردِ سفر لے کے آ گیا

اب ہماری نامراد ٹریننگوں اور کورسز کے چند دل دہلا دینے والے واقعات سُنیے۔۔۔

ایک بار ایم پی ڈی ڈی کی سرکاری ٹریننگ میں ہمیں وہ جو ہر مرا نظر آ گیا جس کی کہ ہمیں مدتوں سے تلاش تھی۔وہ صاحبہ ڈی جی خان سے تشریف لائی تھیں اور کسی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ہم نے 'پونڈ' بن کران کے ہوٹل کے کئی چکر لگائے۔بلکہ بعد میں تو وہ کئی بار لاہور آ کر ہمارے خرچے پر ہی اچھے ہوٹلوں میں ٹھہرتی رہیں۔ایک بار ہم نے بھی سوچا چلو ڈی جی خان انہیں ملنے چلتے ہیں۔پتہ پوچھتے پوچھتے جب موصوفہ کے دفتر پہنچے۔تو وہ گھونگھٹ نکالے نماز ادا فرما رہی تھیں۔قریب ہی ایک صاحب کرسی پر براجمان تھے۔جنہوں نے جل کر نیم دلی سے ہم سے ہاتھ ملایا۔سلام پھیرتے ہی انہوں نے اس رقیب روسیاہ یعنی اپنے موجودہ مجازی خدا سے ہمارا تعارف یوں کروایا کہ 'سلطان انکل کی لاہور سیکرٹریٹ میں بہت جان پہچان ہے' ہم پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔جس کا غصہ ہم نے ان کی چائے کی آفر کو زور سے ٹھکرا کر نکالا۔بلکہ مزید بدلہ لینے کے لیے موصوفہ کو بہن کہہ کر منوں مٹی نیچے دفن کرنے کی اپنی طرف سے بھرپور کوشش کر ڈالی۔یہ سنتے ہی موصوفہ کے چہرے پر نمازیوں والا پاکیزہ اور بہنوں والا دزدیدہ سا سایہ لہرا گیا۔حاسد مجازی خدا کے چہرے کا تناؤ قدرے کم ہوتے دیکھ کر ہم نے اُسے بھی فوراً بھائی جان کہہ ڈالا اور رخصت لے لی۔اور پھر انجام یہ کہ گردِ سفر لے کے آ گیا۔

ایک اور دفعہ ہم لونگ آئی لینڈ نیو یارک کے ایک سیون الیون میں کسی کی گرل فرینڈ کو توڑنے پر لگے ہوئے تھے کہ اس خاتون نے ہمیں وارننگ دی کہ اگر میرے بل ڈاگ نما بوائے فرینڈ نے تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا۔تو اس سے قبل کہ میں تمہیں بھائی کہہ بھی دوں تمہاری دائیں پسلی ٹوٹ چکی ہوگی۔ہم نے اس ناگہانی آفت سے بچنے کے لیے کاؤنٹی کے ایک ٹریننگ ہال کو گوشہ عافیت پایا اور اس کی بھی رجسٹریشن اپنی جیب سے ایک کورس 'ٹیم بلڈنگ' میں اس امید پر کرا دی کہ اس طرح ہم اس ناگہانی کتے سے بھی بچ جائیں گے۔اور شائد موصوفہ ہمارے ساتھ مل کر ٹیم بنانے پر بھی راضی ہو جائے۔یہاں بھی ہماری قسمت نے ہی ہمیں گناہ کی لذت سے بال بال بچایا۔ہوا یوں کہ اس گوری نے اسی کلاس میں سے نیا بوائے فرینڈ تلاش کرلیا۔وہ لفٹ تو ہم ہی سے لیتی رہی لیکن وقت اس بھورے گدھے کو دیتی رہی۔

سب سے دردناک تو وہ کورس ہے جو ہماری پی ایچ ڈی کرنے کی وجہ بن گیا تھا۔ماسٹرز کے آخر میں خوبصورت دانتوں والی ہماری کلاس فیلو نے ہمیں پکا یقین دلایا کہ وہ فوری طور پر ماسٹرز کے بعد پی ایچ ڈی میں داخلہ لے لے گی۔ہم خوشی سے پھولے نہ سمائے اور والدین کو اعلیٰ تعلیم کی غرض سے شادی لیٹ کرنے کا کہہ دیا۔بنک سے تھوڑا قرض لے کر موصوفہ کا داخلہ بھی جمع کرا دیا۔ایک دوپہر ہم اس کے ساتھ گاڑی پر بنک کی اس ماہ کی قسط جمع کرانے جا رہے تھے کہ اس نے ذرا اداس لہجے میں کہا کہ آج ہم ایم ایم عالم روڈ پر کافی نہیں پی لیتے؟ اپنی گلی کے موڑ پر اترنے سے قبل اس نے

ہمارے ہاتھ میں ایک شادی کارڈ تھما تے ہوئے تا کیدی لہجے میں کہا کہ ضرور آنا۔اور مُو ئے کسی دوسرے کلاس فیلو ارشد کا نام لیتے ہوئے کہا کہ وہ بھی شدت سے کہہ رہے تھے کہ 'بدھو میاں سے کہنا کہ ہماری شادی پر ضرور آنا۔

اور اب حالات یوں ہیں کہ اس تلاش صنم میں ہم نے کئی کورسز اور ڈگریاں کر ڈالی ہیں۔ہمیں صنم تو ملے نہیں البتہ سرٹیفکیٹ بہت سے مل گئے ہیں۔وہ جو شاعر نے کہا ہے

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

تو ہم نے شاعر کے اس خیال اور اس کے شعر کو آدھا غلط کر کے دکھادیا ہے۔یعنی وصالِ صنم تو نہیں ملا لیکن جنجالِ علم ضرور ہمارے ہاتھ آ گیا ہے۔اب پوزیشن یہ بن چکی ہے کہ ہمارے فوٹو البم میں اتنی حسیناؤں کی تصویریں نہیں ہیں جتنے دوسری البم میں ڈگریاں اور سرٹیفکیٹس جمع ہو چکے ہیں۔ بظاہر گو کہ عام عوام ہمیں بہت تعلیم یافتہ سمجھتی ہے۔لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو محض سزا یافتہ سمجھتے ہیں۔ بلکہ اگر پارلیمانی آداب کے منافی نہ سمجھا جائے تو اپنے آپ کو الو کا پٹھا سمجھتے ہیں۔کوئی جب کہتا ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔تو یقین کریں ہم جل بُھن جاتے ہیں۔کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ یہ محاورہ یارلوگوں نے محض ہمیں تنگ کرنے کے لئے ہی وضع کیا ہوگا۔اور آج اس جلتی پر تیل کا کام جناب حسنین جاوید نے ہماری موجودہ ٹریننگ کے اختتام پر یہ اعلان کر کے کیا ہے۔کہ ہم اس تربیت بالغاں کے کورس میں بھی پاس ہو گئے ہیں۔اور بجائے کسی موصوفہ کے اب کی بار بھی ایک عدد مزید سرٹیفکیٹ ہمارے ہاتھ میں تھما دیا ہے۔

موسم کی پہلی بارش

پروین شاکر نے کہا تھا:

میں کیوں اس کو فون کروں
اس کے بھی تو علم میں ہوگا
کل شب۔۔۔۔
موسم کی پہلی بارش تھی!

محبت کا تقاضہ قربت ہے اور قربت کو یار لوگ محبت کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا دائرہ ہے۔ کہ جس میں انسان نوجوانی میں پہلا قدم دھرتا ہے تو پھر عمر بھر گول چکر ہی لگاتا رہتا ہے۔ کبھی اپنے قلمی علم کے باعث خدا سے محبت اور انسان سے محبت کے تصور کو آپس میں غلط ملط کر دیتا ہے۔ اور کبھی اپنی نفسانی محبت کا جب سر عام اظہار نہیں کر تو سکتا عیاری کے ساتھ جسمانی اختلاط کی خواہش والی محبت کو صرف محبت کہہ کر ماں باپ والی محبت کا مذاق اڑاتا رہتا ہے۔ معاملہ کچھ بھی ہو بس اس لفظ محبت کی ریڑھ مارنے میں شعراء اور فلسازوں کا ایک ایسا گٹھ جوڑ نظر آتا ہے جس طرح کا مولوی اور ملٹری کے درمیاب رشتہ ہوتا ہے۔ یا پھر بیوی اور سالی کے درمیان طویل گفتگو میں شوہر حضرات کی نا اہلیت پر اتفاق رائے والا معاملہ ہوتا ہے۔

اوائل محبت میں لڑکا لڑکی دونوں ہی ایک دوسرے کو فون کرنے میں پہل کرنے کو بے عزتی نہیں سمجھتے۔ اور موسم کی پہلی بارش برستے ہی جھٹ سے ایک دوسرے کو فون کرنے میں پہل کرتے ہیں۔ پھر اگلا دور شروع ہوتا ہے کہ جب وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو کر دوران محبت جیسے حرب وضرب کے دور میں داخل ہوتے ہیں اور پھر پہلے روز والی اپنی محبت جتانے میں پہل کرنے کی بجائے دوسرے کی محبت کو ٹیسٹ کرنے کے لئے موسم کی پہلی بارش میں اسکے فون کا انتظار کرنے لگ جاتے ہیں۔ پھر تیسرا گیئر لگتا ہے اور موسم کی پہلی بارش پر دونوں کا آپس میں ٹیلی فون پر کچھ یوں تبادلہ خیال ہوتا ہے کہ بیگم واپسی پر آدھا کلو دہی پکڑتے لاتے وغیرہ کا حکم دے رہی ہوتی ہے۔ تیسرے گیئر میں گاڑی چلاتے چلے جانے کی صورت میں یہ خواہش ضرور ابھرتی ہے کہ چوتھا گیئر بھی آزمایا جائے۔ بشرطیکہ سڑک صاف ہو۔ بس موسم کی پہلی بارش پر اس روز اتفاقاً اگر میاں بیوی کی فون پر بات ہو جائے۔ تو خاتون خانہ خاوند کو جلد گھر بلا رہی ہوتی ہے۔ تو وہ بے چارہ یہ سمجھتا ہے کہ شاید یہ محبت کی بھینگی چال ابھی زوروں والی رفتار پر قائم و دائم ہے۔ مگر گھر پہنچتے ہی بیچارے خاوند کو یکدم فل بریک لگانے پڑ جاتے ہیں۔ کیونکہ وہاں کوئی عروسی جوڑا سجا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ اوپری منزل والے باتھ روم کے نلکے کی بارش سے نیچے سیلاب آیا ہوا ہوتا ہے۔ اور دونوں اس پریشانی کو آپس میں شیئر کر رہے ہوتے ہیں۔ کہ موسم کی

پہلی بارش کا سیلاب اپنی جگہ پر مگرفی الوقت اس نئی آفت سے نبٹنے کے لئے کسی پلمبر کو تلاش کیا جائے۔

دنیا میں انسانوں پر جوانی بھی آتی رہے گی۔محبت بھی چلتی رہے گی۔قربتیں بھی میسر رہیں گی۔موسم کی پہلی بارش بھی ہوتی رہے گی۔محبت کرنے والوں یا ساتھ رہ کر گزارہ کرنے والوں کے فون کا تبادلہ بھی ہوتا رہے گا۔اور باتھ روم مرمت کرانے کے لئے پلمبرز کی تلاش بھی جاری رہے گی۔بس اسی طرح ہر انسان دائروں میں بھی گھومتا رہے گا۔اور اس دائرے میں وہ جس مقام سے بھی گزر رہا ہوگا اسی حالت میں جھومتا بھی رہے گا۔البتہ جو کام شاید نہ ہو پائے گا وہ یہی ہوگا کہ اپنی زبان دانی کی تنگی داماں کے باعث لفظ محبت کو ہمارے شاعر اور فلمساز جس طرح رگڑ رہے ہیں۔اس کو اسی طرح گڑتے چلے جائیں گے۔لیکن ہر کسی کو لفظ محبت کے اصل معنی کہیں بڑھاپے میں جا کر سمجھ آئیں گے۔

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

میڈیکل کانفرنس میں جانے کے زریں اصول

بہار کی آمد کے ساتھ ہی کانفرنسوں کی بہار بھی شروع ہو جاتی ہے۔اب کے بار ڈاکٹر خطائی بضد تھے کہ ڈاکٹروں کی انٹرنیشنل کانفرنس میں تجھے لے کر ہی چلیں گے۔بالآخر ہم نے بیگم کو خوش خبری دی کہ تین روز کے لئے ہمارے ناشتے اور کھانے باہر۔الٹا بوری بھر کے دوائیوں کے سمپل، پین اور تھیلے بونس کے طور پر۔بیوی نباض تھی جھکتے ہوئے مشورہ دیا کہ سرتاج پہلے اور بعد میں اپنا وزن ضرور کر لیجئے گا ہم نے سنی ان سنی کرتے ہوئے ڈاکٹر خطائی کے ساتھ ڈاکٹروں کی اس برس کی عالمی کانفرنس میں جا ڈیرہ جمایا۔

خیر ہم نے ایوان اقبال کی ریوالونگ چیئر والی ٹیبل پر ابھی اپنا خالی پیٹ امید بھرے مستقبل کے سہارے ایڈجسٹ ہی کیا تھا کہ ڈاکٹر خطائی دس بارہ پھولے ہوئے اشتہاری بیگ ہماری حفاظت میں دے کر رفو چکر ہو گئے۔ہمیں چونکہ ایسے تحفے ملتے نہیں ہیں اس لیئے حسب توفیق کچھ پین اپنی جیب میں ٹھوس لیے کیونکہ بال پن اور پوائنٹر آج کل خاصے مہنگے ہو چکے ہیں۔ہال تقریبا اوپر سے نیچے تک خالی تھا بلکہ کسی پچھلی نشست سے صاحب خرگوش کے خراٹے کبھی کبھار بے خیالی میں نکل جانے والے خراٹے ماحول کو بے سکون کر دیتے تھے۔نیم روشن خوابیدہ ہال کے سٹیج کی جانب روشنی تھی۔اور کوئی ماہر پروفیسر انگریزی کی طرح کی کوئی زبان بول رہے تھے۔ڈاکٹر صاحب کی انگریزی سمجھ میں آتے ہی ہم نے ڈسپلے بورڈ پر نظریں گاڑلیں اور شدت سے انتظار کرنے لگ گئے کہ پاکستانی اعدا شمار اور حقائقِ تندرستی بھی شائد سننے کو مل جائیں نہ جانے کب نیند کی وادی میں چلے گئے ۔ابھی ہم نے محض دو چار ہی خراٹے نشر کئے ہوں گے کہ اچانک لوگوں کے دوڑنے کے کے شور سے چونک کر ہم نے بھی اپنے آپ کو بے خیالی میں اسی جانب بھاگتے پایا۔ہمارے پاس اس حیرت کو مٹانے کا ہرگز موقع نہ تھا کہ سونے سے قبل کے چند درجن لوگ اب اچانک چند ہزار کیسے بن گئے تھے۔ہم نے ایک لمحے کے لئے ذرا رکنے کا سوچا ہی ہوگا کہ اسی لمحے کسی انتہائی باوقار شخصیت کے بھوک کے مارے پھولے ہوئے سانس نے اپنے تنومند پیٹ کی ٹکر ہمیں عقب سے رسید کر دی۔ہم کہ ٹھہرے بدھو کے بدھو۔رک کر اپنے اس واقف ڈاکٹر سے بات کرنے ہی والے تھے۔اور اس کے ڈھول نما خالی پیٹ کو سہلانا ہی چاہتے تھے کہ یوں لگا کہ ہوا میں اڑ رہے ہیں۔دراصل ایک چھوٹے قد والے ڈاکٹر میری ٹانگوں کے درمیان سے گزر کر روٹی بوٹی پر حملہ آور ہو چکے تھے۔

اس ہجوم عاشقانِ من وسلویٰ میں ابھی ہم ہچکولے کھا ہی رہے تھے کہ ہماری بچپن کی دی گئی کوئی خیرات شائد کام آ گئی ۔یعنی ہم نے اپنے آپ کوئی کندھوں کے اوپر سے بازو گھما کر پلیٹ پکڑتے ہوئے دیکھا۔اور پھر کوئی ڈش ایسی نہ تھی جس کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہماری پلیٹ میں نہ ہوں۔ہم نے ایک لمحے کے لئے اپنے محسن دوست ڈاکٹر خطائی

کے بارے میں سوچا۔ نیز ساتھ ہی ایک نگاہ غلط اپنی اعلیٰ تعلیم اور تربیت پر ڈالی۔ مگر پھر نظریہ ضرورت کے تحت اس پیٹ دوست ماحول کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ کیونکہ ہماری عدالتوں کے علاوہ یہ بات ہم نے امریکہ میں سیکھی تھی کہ سڑک پر اگر آپ کے آس پاس سب ہائی سپیڈ ہوں تو آپ پر آہستہ گاڑی چلانے پر جرمانہ ہوگا۔ کیونکہ آپ کی وجہ سے ٹریفک بلاک ہونے کا خدشہ ہوسکتا ہے۔ نظریہ ضرورت کے ان دلائل کے ذہن میں آتے ہی ہم نے مزید تیزی سے بوٹیاں بھنبوڑنی شروع کردیں۔

چمچ گرنے، گلاس ٹوٹنے اور انتہائی معزز پڑھے لکھے لوگوں کی آہ و بکا کے بیچوں بیچ ہم اضافی کولڈ ڈرنکس پی کر فارغ ہوتے ہی یہ دیکھ کر ہمارے چودہ طبق روشن ہو گئے کہ بیگم کے پسندیدہ سوٹ پر جا بجا چھیچھڑے اور سویٹ ڈش کے داغ ثبت ہو چکے تھے۔ اب نہ تو کھانا نہ ملنے کا بہانہ کیا جا سکے گا۔ اور نہ اپنی بے ہودگی چھپائی جا سکے گی۔ ہمارے من کے اندر کی دنیا سے ایک حوصلہ افزا پیغام آ رہا تھا کہ یہ تن کی دنیا سو دو سو دا مکر و فن ہے۔ ہم ڈاکٹر خطائی سے تو بہر طور بہتر ہیں جو ہال کی بیرونی سیڑھیوں کے دو پائیدانوں پر انواع و اقسام کے پکوان سجا کر غالباً زندگی کے آخری کھانے کی تکہ بوٹی کر رہے تھے۔ ہم کم از کم زمین پر تو نہ بیٹھے تھے۔ اور ہماری داڑھی میں کوئی تنکا تک نہ پھنسا تھا۔ تاکہ احباب سمجھ ہی نہ پائیں کہ آج کون کون سا ایندھن واصل جہنم کیا۔ ہاں ہمیں اس وقت تھوڑا سا تو ہین کا احساس ہوا۔ جب ہمیں دیکھتے ہی ڈاکٹر خطائی نے حکم صادر کیا کہ یار چار کپ کشمیری چائے بھی پکڑتے لانا خوب ڈرائی فروٹ ڈال کر۔ حالانکہ ہم ابھی ان سے خاصے دور تھے۔

اس تمام طوفان باد و باراں کا مشاہدہ اپنی ندیدی آنکھوں سے کرنے کے باوجود بھی ہم نے ڈاکٹر خطائی کی وضاحت کو دل و جان سے مان لیا کہ ساری مذکورہ بدتمیزی ڈاکٹروں نے نہیں کی بلکہ اس میں اکثریت فارما کمپنیوں کے میڈیکل ریپ کی تھی۔ جب ہم نے دونوں کے بیچ فرق جاننا چاہا تو انہوں نے ایک ہی خوبصورت نکتے میں سمندر سمو دیا کہ کمر سے لگے پیٹ والے سب غیر ڈاکٹر تھے۔ جبکہ تندرست اور لٹکے ہوئے پیٹوں والے ڈاکٹرز تھے۔ واہ میرے مولا۔ بالفاظ دیگر وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ڈاکٹر دراصل وہ ہے جو کھاتے پیتے مر جانے کا فن جانتا ہو۔ تو دوستو احسن اصول یہی طے پایا کہ گلے تک کھانا ٹھنسا ہونا چاہیے کیونکہ اگلے سانس کا کچھ خاص بھروسہ نہیں۔

ہمارے اس حسین تجربے نے تو اب ہمیں کنسلٹنٹ بنا ڈالا ہے۔ تو چلیے اسی ناطے سے ہم آج آپ کو دس ایسے زرین اصول بتاتے ہیں۔ جن کو اپنا کر آپ کامیابی سے کوئی بھی میڈیکل کانفرنس اٹنڈ کر سکتے ہیں۔ بس اے میرے ہم نشینو نوٹ کریں پہلا اصول۔ زندگی کا آخری کھانا کھانے کے لئے کسی بھی میڈیکل کانفرنس میں جانے سے تین روز قبل اور سات روز بعد میں بھوکا رہنا ضروری ہے۔ ورنہ بدہضمی اور فوڈ پوائزننگ کے آپ خود ذمہ دار ہوں گے۔ دوم، اگر آپ کی عام زندگی میں اپنے کسی خیر خواہ ڈاکٹر دوست سے ملاقات نہیں ہو پاتی تو کم از کم ان سے ملنے کے لئے کانفرنسوں میں ضرور جایا کریں وہ انشاءاللہ آپ کو لنچ کے قریب ہی مل جائیں گے۔ سوم، کانفرنس میں صبح ساڑھے سات بجے، دن کے تین بجے، اور رات نو بجے ضرور جائیں کیونکہ درمیانی اوقات میں پنجابی سامعین کے لئے انگریزی در فتنی محض تو ہین معاشرت ہے۔ چہارم، اپنی یا کسی کی گاڑی تینوں اوقات کے بعد ضرور منگوا لیا کریں تاکہ فارما کمپنیوں کے تحفے کہیں غرق

دریا نہ ہو جائیں ۔پنجم،قیمتی سوٹ پہننے کی بجائے عام سوٹ پہن کر جائیں چونکہ سردی،گرمی بذمہ ہال کی انتظامیہ کے ہے۔لیکن آپ کے قیمتی اور پسندیدہ سوٹوں کی غتربود آپ کے ذمے ہے۔ ششم،اگر آپ کی شخصیت متاثر کن نہیں تو کم از کم عینک اور وگ ضرور لگائیں تاکہ ڈاکٹر نظر آسکیں ۔ہفتم،فیملی کے علاوہ ایک عدد ملازم ساتھ ضرور رکھیں تاکہ لنچ کے شورِ محشر میں سہارہ شکم بھی بن سکے ۔اور وقتاً فوقتاً کمپنیوں کے تحفے گاڑی میں بھی رکھ آیا کرے ۔ہشتم،بنکویٹ اور کلچرل شام ہرگز مس نہ کریں مگر صرف دوستوں کے ساتھ۔ورنہ نزلہ کی موجودگی کے باعث زوجہ کے نزلہ کے آپ خود ذمہ دار ہوں گے۔نہم،رجسٹریشن کبھی جیب سے نہ کرائیں یہ فارما کمپنیاں غضب کی کمائی سے بھلا آپ کا خیال کیوں نہ کریں ۔اگر آپ ڈاکٹر نہیں بھی ہیں تو کوئی ڈاکٹر دوست تو ہوگا ہی ۔دہم،ایک عدد ایگزیکٹو کمیٹی والا بلا ضرور سینے پر آویزاں رکھیں تاکہ نچلے طبقے کے ڈاکٹروں والے ڈائننگ ہال کی بجائے VIP ہال میں جگہ پاسکیں ۔رہ گئی علمی ورفطیاں تو گھر کے آرام دہ ماحول میں کمپیوٹر پر بیٹھ کر انٹرنیٹ کی انہی سائٹس سے وہ سارا کچھ پڑھ لیں جہاں سے ان ماہر پروفیسروں نے پڑھ کر یہ لیکچر بنایا ہوا ہوتا ہے۔اور ان کا مقصد امریکی لہجوں میں کارآمد اوقات یعنی کھانے کے درمیانی وقفوں میں ہمیں محض بور کرنا ہوتا ہے۔آخری التماس ہے کہ یہ نکتہ دانیاں کہیں ڈاکٹروں،انجینیروں،کی انجمنوں کو نہ بتا دیں ۔ورنہ بے چارے کانفرنسیں منعقد کرانے کا تردد کرنے کی بجائے نوٹس، تحفے اور لنچ بکس آپ کے گھروں میں نہ بھجوانا شروع کر دیں کیونکہ دنیا میں وقت کم اور مقابلہ سخت ہوتا جارہا ہے۔

پانی سے گاڑی چل سکتی ہے

ہمارے کسی دوست نے ایک بار کہا تھا کہ اگر اخبارات میں سے "گا، گے، گی" جیسے الفاظ نکال دیئے جائیں تو آدھا اخبار خالی ہو جائے گا۔اس بات کو یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ اگر سیاستدانوں کے بیانات میں سے بھی یہی الفاظ نکال دیئے جائیں تو وہ سب کے سب یکدم گونگے ہو جائیں گے۔اگر سیاستدان گونگے ہو گئے تو اخبارات خالی ہو جائیں گے۔لیکن یہ بھی درست ہے کہ اگر اخبارات خالی ہو گئے تو سیاستدان اندھے ہو جائیں گے تو کیا سیاستدانوں اور میڈیا کا چولی دامن کا ساتھ ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ ایسا کہنا کسی حد تک تو صحیح ہے لیکن یہ مکمل طور پر درست اس لئے نہیں ہے کہ اس حمام میں صرف سیاستدان ہی ننگے نہیں ہیں بلکہ اب تو ماشاءاللہ سائنسدان بھی ننگے نظر آنے لگ گئے ہیں۔ ہمارے ساتھ قوم کے تقریباً سبھی فارغ عوام نے ٹی وی پر حامد میر کی دھواں دار مدح سرائی اس عظیم سائنسدان کے لئے دیکھی ہوگی کہ جو موصوف پانی سے کار چلانے کے حق میں دلائل دے رہے تھے۔ہمارا خیال ہے کہ موصوف سائنسدان کے ساتھ یہ بہت بڑی زیادتی کر دی گئی ہے کہ اس بے چارے کے دعوے کو ٹیسٹ کرنے یا دہرانے کی بجائے تضحیک کا نشانہ بنا دیا گیا اور وہ بدنصیب ہمارے بھائی نوبل پرائز سے محروم رہ گئے ہیں۔خیر اس کا ایک فائدہ انہیں اور صوبہ سندھ کو ضرور پہنچا ہے کہ موصوف اور ان کی عظیم یونیورسٹی کئی ماہ تک میڈیا کی سرخیوں میں رہے۔یہ بھی بہت بچت ہوگئی کہ اس عظیم سائنسدان کے اساتذہ اور وائس چانسلر نے اپنے عہدوں سے استعفیٰ نہیں دے مارا اور پاکستان عالمی سطح پر ذلت آمیز سائنسی کارنامے سے بال بال بچ گیا۔ورنہ یہ عین ممکن تھا کہ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ والے اپنا ہیڈ آفس مستقل طور پر پاکستان میں منتقل کر لیتے اور صبح شام جو عظیم عالمی ریکارڈ یہاں بن رہے ہیں ان کو چھاپ چھاپ کر ہلکان ہوتے رہتے۔

ہمارے نزدیک اس عظیم اور مظلوم سائنسدان نے کوئی انوکھا دعویٰ تو نہیں کر دیا تھا کہ اسے نوبل پرائز اور گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے قابل نہ گردانا گیا۔اس سے قبل ہمارے بے شمار رہنمایانِ قوم پانی سے گاڑی تو نہیں چلا سکے لیکن ہواؤں میں بے شمار قلعے نہ صرف تعمیر کر چکے ہیں بلکہ تادمِ تحریر مسلسل تعمیر کرتے چلے جا رہے ہیں۔مثال کے طور پر ہم نے اپنی گنہگار آنکھوں سے خود اخبارات میں کبھی پڑھا تھا کہ فیلڈ مارشل ایوب خان صاحب نے دنیا بھر کے میڈیا کے سامنے 1965 کی پاک بھارت جنگ میں یہ دعویٰ داغ دیا تھا کہ ہم بھارت کو عبرتناک شکست دے کر کشمیر کو آزاد کرا لیں گے۔صدر ایوب کے اس ہوائی قلعے میں بالآخر کشمیر کو بھی قلعہ بند ہونا پڑا۔ڈیڈی کی اس آواز میں ہونہار وزیراعظم پاکستان ذلفی نے 1971 میں یوں ہاں میں ہاں ملائی کہ اقوام متحدہ کے اجلاس میں دنیا بھر کے سامنے پولینڈ کی قرارداد پھاڑتے ہوئے ایک نیا طاقتور قلعہ ہوا میں یہ کہتے ہوئے تعمیر کر کے دکھا دیا کہ ہم بھارت سے ہزار سال تک جنگ کریں

گے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ خیر ان کا آدھا ہوائی قلعہ ڈھنے سے بچ گیا کہ جب دو ماہ بعد ہی بھارت نے پاکستان کے ٹکڑے کر دیئے۔ اور انسانی تاریخ کی عظیم فوج کے بانوے ہزار جوانوں کو قید کر لیا۔ جس طرح پانی والے سائنسدان کو ہم نے ہاتھ باندھ کر زبردستی نوبل پرائز جیتنے سے محروم کر دیا ہے۔ اسی طرح بالآخر ایوب ڈیڈی کی فوج نے خوبصورت زلفی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر گردن ڈھائی فٹ لمبی کر دی۔ اور اس طرح ان کے ہوا میں قلعہ تعمیر کرنے کے عظیم کارنامے کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔ حالانکہ وہ بھی ملالہ جیسے لاکھوں شہیدوں کی طرح نوبل پرائز بس جیتنے ہی والے تھے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ہم تو عظیم قوم ہیں لیکن ہمیں دشمن ہی ترقی کرنے نہیں دیتا۔ حالانکہ ہم سے زیادہ عقلمند اور ذہین سائنسدان اور سیاستدان کسی قوم نے پیدا نہ کئے ہوں گے۔ یعنی ہم شیر کا شکار کر دکھائیں بشرطیکہ پڑوس کا کتا ہمیں گلی سے گزرنے دے۔

قدرت نے کائنات میں تین بنیادی اجزاء جمع کر رکھے ہیں یعنی ہوا' پانی اور مٹی۔ ہم نے ہوا اور پانی کو تو فتح کرنے میں ایسے ایسے کمالات دکھا دیئے ہیں کہ قدرت بھی شاید لرز گئی ہوگی کہ پاکستانیوں نے کس کس طریقے سے اس کی دو تہائی حکومت کو زیر کر رکھا ہے۔ یعنی ہوا میں اس قدر عظیم قلعے دیکھ کر ہوا نے اور پانی سے گاڑی چلتے دیکھ کر پانی نے ہم سے پناہ مانگ لی ہے۔ اب رہ گیا قدرت کا اگلا جزو یعنی مٹی۔ ہم نے اس میدان میں بھی حالانکہ ریت کے قلعے بنا کر بہت سے اہم کارنامے سرانجام دیے ہیں اور عالمی ریکارڈز توڑنا تو ایک طرف بلکہ مار مار کر اور جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ان کا بھرکس نکال دیا ہے۔ لیکن پھر بھی وطن کی اس مٹی نے ہم سے ہار نہ مانی تھی۔ اور بڑی اکڑ میں تھی کہ میں ہوا اور پانی کی طرح مائع یا گیس نہیں ہوں ٹھوس ہوں بلکہ اس قدر ٹھوس کہ مجھے شاید یہ لوگ پانی اور ہوا کی طرح شرمندہ نہ کر سکیں۔ لیکن مٹی کی یہ خام خیالی حال ہی خاک میں مل گئی ہے کہ جب تھر پارکر کے ریتلے ٹیلوں سے درجنوں بھوک کی ماری ہوئی بچیوں بچوں اور ان کی ماؤں کی لاشیں پے در پے نکل آئی ہیں اور ان کی روحیں ہمارے وزیروں' مشیروں کے دورۂ تھر پارکر میں مرغن کھانوں کے ارد گرد چنگاڑ رہی ہیں۔ صحرا سے اتنی لاشیں چونکہ پہلی بار برآمد ہو رہی ہیں تو اب تو گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ والوں نے اپنا ہیڈ آفس مٹھی میں مستقل قائم کر لیا ہوگا۔ کہ یہاں سائنسدانوں اور سیاستدانوں کے ساتھ ساتھ حکمرانوں نے دنیا کے عظیم کارناموں کے ایسے ایسے ریکارڈز بنانے اور توڑنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ کہ بار بار آنے سے بہتر ہے مستقل ہی یہاں رہ لیتے ہیں۔ ان کے یہاں شفٹ ہونے کے مزید کئی ایک فوائد بھی ہیں۔ مثلاً قریب ہی ان کو بھرے پیٹ والا بلاول یوتھ فیسٹیول میں جھومتا گھومتا بھی مل جائے گا۔ اور اس طرح انہیں ہمارے عظیم رہنماؤں اور نحیف عوام کے تقابلی جائزہ لینے کے لئے زیادہ تگ و دو بھی نہ کرنی پڑے گی۔ یہ سارے ہوا، پانی اور مٹی والے ریکارڈ تو ہم نے توڑ کر دکھا دیئے ہیں مگر ایک ایسا انہونا واقعہ بھی یہاں رونما ہو گیا ہے کہ اب سمجھیں کہ ہمیں عالمی ریکارڈز کے ساتھ ساتھ نوبل پرائز بھی منتیں کر کر کے دیئے جائیں گے۔ اور پھر قدرت کے تینوں شاہکار یعنی ہوا، پانی اور مٹی بھی منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ کہ جب انہیں خبر ہوگی کہ ہمارے محبوب وزیر اعظم نواز شریف نے مٹھی پہنچ کر بھی کچھ کھانے پینے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ یہ ایک عجب سی اور الٹی پلٹی سی بات لگتی ہے کہ دیگیں بھی کھڑک رہی ہوں لیکن ہیرو وزیر اعظم پر اس کا اثر بھی نہ ہو رہا ہو۔ اب تو احمد رُشدی عالم بالا میں اپنا مشہور نغمہ کچھ یوں گنگنا رہے ہوں گے کہ:

پانی میں دیا جل سکتا ہے دریا آگ چل سکتا ہے
جل سکتی ہے سورج کی کرن پر تجھ کو بھلانا مشکل ہے
پانی سے انجن چل سکتا ہے ہوا میں قلعہ بن سکتا ہے
ہو سکتا ہے لاشوں پہ جشن نواز بھوکا رہ سکتا ہے
یہ ریکارڈ توڑنا مشکل ہے
اور تجھ کو بھلانا مشکل ہے

شکر ہے وہ خواب تھا!

رات خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ہمیں شہنشاہ پنجاب شہباز شریف کے دربار میں پیش کر دیا گیا ہے۔ وہ ہم سے ناراض دکھائی دے رہے ہیں اور ہم ڈر کے مارے اپنے داہنے ہاتھ کی چند انگلیوں کو مروڑ مروڑ کر دل ہی دل میں اپنے آپ کو برا بھلا کہہ رہے ہیں کہ نہ وہ ہمارے قلم کی مدد کرتیں اور نہ ہم خادم شہنشاہ کے تیز ترین ترقیاتی منصوبوں کے خلاف کچھ لکھ پاتے۔ حالانکہ ہم نے کہیں بھی سچ کو تلخ نہیں ہونے دیا تھا اور اس قدر میٹھا لکھا کہ اکثر قارئین اس ڈر سے ہمارے کالم سے پرہیز کرنے لگ گئے کہ کہیں انہیں ذیابیطس نہ ہو جائے۔ اب سین یہ تھا کہ موصوف شہنشاہ کے دائیں جانب ایک چمچہ خاص نے ہاتھ میں ہمارے لکھے گئے کالموں کا ایک پلندہ دبا رکھا تھا اور بائیں جانب رانا ثناء اللہ تلوار لیے کھڑے تھے۔ دربار حاشیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور ہمیں اس میدانِ حشر میں کوئی ایسا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا جس سے خیر کی توقع کی جاتی۔ وہاں تین چار گروہ نمایاں نظر آ رہے تھے۔ ایک گروہ ان بیوروکریٹس کا تھا جنہوں نے ترلے کر کر کے خادم اعلیٰ سے سستے تندور کھلوائے تھے۔ نیز لاہور شہر کے بیچوں بیچ میٹرو بس کے اردگرد جنگلہ تعمیر کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ دوسرا گروہ ''لفافہ صحافیوں'' کا تھا۔ جنہوں نے نہایت عرق ریزی سے ہمارے جملوں کی مٹھاس میں سے بھی زہر کشید کر کے جہاں پناہ کا مزاجی پارہ بلند کر رکھا تھا۔ تیسرا گروہ ان کاروباری و سیاسی حضرات کا تھا کہ جن کو خدشہ تھا کہ ہمارے کالموں میں چھپی سچائیوں میں سے کسی ایک سے بھی اگر وزیراعلیٰ متفق ہو گئے تو پھر ان کی روٹی بوٹی بند۔ چوتھا گروہ کچھ ''فرنٹ مین'' قسم کے دلالوں پر مشتمل تھا کہ جن کا ایمان تھا کہ اگر ظلِ الٰہی نے برق رفتاری سے سیاسی اور ترقیاتی منصوبے جاری نہ رکھے تو ان کا بوریا بستر گول ہو سکتا ہے۔ ایک گروہ ''خواجہ سراؤں'' کا بھی تھا کہ جن کے بارے میں اس مصیبت کے وقت میں بھی ہمیں ہنسی آ رہی تھی کہ یہ محض شہباز شریف کے منہ سے نکلے ایک ہی جملے پر فل ٹھک ڈانس کرنا شروع کر دیتے تھے۔ اور اس قدر شور و غوغا کرتے تھے کہ ہر طرح کا کڑوا یا میٹھا سچ اس رولے میں دفن ہو رہا تھا۔

اچانک شہنشاہ نے اپنا چہرۂ مقدس ہماری جانب موڑا۔ اور جذبات سے بھرپور تقریری انداز میں فرمایا کہ لاہور کی آبادی ایک کروڑ سے تجاوز کرتی جا رہی ہے۔ تو کیا ہم لاکھوں لوگوں کو سفر کی سہولیات دینے کے لئے میٹرو بس کا جال نہ بچھاتے؟ ہم نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے ان کی ہاں میں ہاں ملائی کہ واقعی جہاں پناہ کے اس منصوبے سے لاکھوں لاہوریوں کو آرام دہ، تیز رفتار اور کم قیمت سفر میسر ہے۔ جہاں پناہ ہمارے جواب پر ابھی خوش ہونے ہی والے تھے کہ دائیں جانب والے چمچۂ خاص نے ہمارا ایک کالم ہوا میں لہرایا اور شہنشاہ ثانی کو متوجہ کر کے کہا کہ جناب یہ ڈر کے مارے ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ حالانکہ اس کالم میں یہ لکھ چکے ہیں کہ پنجاب کے کل بجٹ کا ساٹھ فیصد صرف لاہور پر لگانے

کی بجائے اگر ہر حلقہ، شہر اور گاؤں میں انصاف کے ساتھ خرچ کیا جاتا تو بیرونِ لاہور کے سسکتے بلکتے عوام کو روزگار، تعلیم اور علاج کے لیے لاہوری نہ بننا پڑتا۔ وہ اپنے ہی علاقوں میں رہتے اور لاہور کی آبادی کروڑوں تک نہ پہنچتی۔ یہ سنتے ہی شہنشاہ نے قہر آلود نظروں سے ہمارے سر کو گھورا۔ اور دوبارہ سے ایک جذباتی تقریر شروع کر دی کہ اگر ہم سستے تندور نہ لگاتے تو لاکھوں لوگ سستی روٹی کیسے کھاتے؟ ہم نے گھبرا کر اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور حاکم وقت کی تعریف فرمائی کہ یقیناً بے شمار مزدوروں اور غریبوں کو سستی روٹی میسر آتی رہی ہے۔ ساتھ ہی ہم نے چور نگاہوں سے چمچۂ خاص کی طرف دیکھا جو ہمارا ایک اور شائع شدہ کالم ڈھونڈنے میں مصروف تھے۔ بالآخر اس کے ہاتھ میں ہمارا ایک اور نامۂ اعمال لہرا رہا تھا، جس میں ہم نے بڑے خلوص سے خادمِ اعلیٰ کو مشورہ دیا تھا کہ لاہور کے لوگوں میں طبقاتی تقسیم کرنے سے کہیں بہتر تھا کہ آٹا مافیا اور ذخیرہ اندوز فلور ملوں سے قانون پر عمل کرواتے تاکہ سال بھر سب لاہوریوں کو مناسب مقدار میں گندم ملتی رہتی اور بازار میں ایک ہی روٹی کے مختلف نام رکھ کر چار قسم کی قیمتیں وصول کرنے کا رواج نہ پڑتا۔ سی ایم صاحب نے پھر قہر آلود نظروں سے ہمارے سر کو گھورا۔ اور اپنی مائیک توڑ عوامی تقریر جاری رکھی۔ اور ارشاد فرمایا کہ ہم نے عوام کو اندھیروں سے نکالنے کا عزم کر رکھا ہے اور چولستان میں ہزار میگاواٹ کا سولر پارک بنانا چاہ رہے ہیں تو کیا نہ بنائیں اور مظلوم عوام کو اندھیروں میں تڑپتا چھوڑ دیں؟ ہم نے دست بستہ عرض کی کہ جناب یہ تو وقت کی ضرورت ہے۔ مگر ہماری مدح سرائی ابھی ادھوری ہی تھی کہ چمچۂ خاص نے ہمارا ایک اور کالم پڑھنا شروع کر دیا کہ دیکھیں یہ لکھتے ہیں کہ دنیا کا سب سے بڑا سولر پارک امریکہ نے کیلی فورنیا میں بنانے کا اعلان کیا ہے جس کی پیداوار محض 660 میگاواٹ ہوگی۔ امریکہ کے مقابلے میں ہم کچھ بھی نہیں لیکن اعلان ایک ہزار کا کر بیٹھے ہیں۔ جواب بن بھی نہیں پا رہا۔ ظلِ الٰہی نے پھر قہر آلود نظروں سے ہمارے سر کو گھورا اور ہم پر طنزیہ اور تمسخرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے بیان جاری رکھا کہ ہم نے عوام کی حفاظت کی قسم کھا رکھی ہے اور سہولتوں کا جال پھیلانے میں دن رات ایک کر رکھا ہے۔ ہم نے بے سود لب کشائی کرنے کی بجائے اپنے سر ہی کو بلا کران کو داد دی۔ لیکن چمچۂ خاص نے پھر بھانڈہ پھوڑ دیا کہ یہ صاحب کالم میں لکھتے ہیں کہ لاہور شہر میں روزانہ دو کروڑ کے ڈاکے نیز گاڑی چوری کے واقعات سے عوام بے حد عدمِ تحفظ کا شکار ہیں۔ اور اس وقت عوام کی مایوسی بہت بڑھ جاتی ہے کہ جب ان ڈاکوں میں پولیس ملوث نظر آتی ہے۔ چونکہ آدھی پولیس مال پانی بنانے اور آدھی پولیس وی آئی پی کی حفاظت میں مصروف نظر رہتی ہے۔ لہذا عوام کا اللہ حافظ۔ اب کے بار تو شہباز بھائی نے خون آلود نظروں سے ہمارے سر کو گھورا۔

درحقیقت سایۂ خداوندی ظلِ الٰہی، شہنشاۂ جمہوریت اور خادمِ اعلیٰ ایک نہایت دردمند دل رکھنے والے سیاسی رہنما واقع ہوئے ہیں۔ بس ذرا طبیعت کی سختی، جولانی اور تیزی ان کی خوبیوں کو گہنا دیتی ہے اور ان کا اچھا سے اچھا منصوبہ بھی بے شمار منفی اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ چونکہ موصوف کبھی کبھار مشیروں سے دور رہ کر انصاف سے بھی کام لے لیتے ہیں اس لئے ہمیں یہ امید بندھ چلی تھی کہ چمچۂ خاص کے بھڑکانے کے باوجود وہ بائیں جانب کھڑے جلاد کو ہماری جان لینے کی تکلیف کرنے کا موقع نہیں دیں گے۔ کہ اچانک انہوں نے چمچۂ خاص سے ہمارے کالموں کی سمری بیان کرنے کا حکم صادر فرما دیا۔ ہم دل ہی دل میں گھبرا گئے کہ اب خیر نہیں کیونکہ موصوف وزیر اعلیٰ کے بارے میں مشہور ہے

کہ اپنی آنکھوں سے حقائق جانچنے کی بجائے اپنے کانوں سے سن سنا کر انصاف کرنے پر زیادہ یقین رکھتے ہیں اور سمری جو وہ سننے جارہے ہیں یقیناً اس میں چمچۂ خاص نے کوئی رو رعایت ہرگز نہ رکھی ہوگی۔ بالآخر چمچۂ خاص یوں گویا ہوئے کہ "حضور یہ کالمسٹ اپنے آپ کو آپ سے زیادہ سیانا سمجھتے ہیں اور آپ کے احکامات کو نادرشاہی احکامات کہتے ہیں۔ اپنے بہترین ساتھیوں سے مشورہ کے بعد بھی آپ جن منصوبوں کا اعلان کرتے ہیں یہ ان میں کیڑے نکالتے ہیں۔ آپ پر پنجاب کا بجٹ صرف لاہور پر صرف کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ آپ پر یہ بھی الزام دھرتے ہیں کہ آپ صرف مالشیوں کی باتوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ زیادہ خطرناک بات یہ کرتے ہیں کہ عملاً صوبہ پنجاب آپ نے اپنے بیٹوں، بھانجوں کے حوالے کر رکھا ہے اور خود سیاسی شعبدہ بازیاں کرتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں جناب یہ آپ کے بڑے بھائی کو بھی نہیں بخشتے اور الزام لگاتے ہیں کہ وہ بھارت کو جو پسندیدہ ترین ملک کا درجہ دینا چاہتے ہیں اس کے پیچھے ان کا مقصد بھارت میں چلتے ہوئے اپنے اربوں کے کاروبار کو بچانا ہے۔ گو کہ یہ حضرت ذاتی طور پر آپ کی حکومت کو زرداری کی حکومت سے بہتر سمجھتے ہیں لیکن لوٹ مار میں اس کے برابر سمجھتے ہیں۔ یہ بھی الزام آپ پر تھوپتے ہیں کہ آپ عالمی طاقتوں کے آلۂ کار ہیں اور بھارت کی خواہش پوری کرنے کے لیے نہ تو پانی سے بجلی بنانے کے بڑے منصوبے مکمل کرانا چاہتے ہیں اور نہ ہی پاکستان میں بھارتی دراندازی پر کوئی روک ٹوک رکھنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ ملک میں بلدیاتی انتخابات نہیں ہونے دیں گے۔ مشرف کو سیاسی ڈرائی کلین کر دیں گے۔ جاگیرداروں کو پھلنے پھولنے دیں گے اور ایک سرمایہ دار کی حیثیت سے عوام کا سارا سرمایہ چوس لیں گے۔ مزید ڈالر ڈرامے کریں گے اور سیاسی طور پر عوام کو اور اداروں کو بھی مضبوط نہ ہونے دیں گے"

بدقسمتی سے سارا خلاصہ ہمارے خلاف چلا گیا تھا اور اوپر سے چونکہ وہ خادمِ اعلیٰ نے کانوں سے سنا تھا جس کا کہ ان پر اثر بھی زیادہ ہوتا ہے اس لیے اب خیر کی توقع عبث تھی۔ لیکن پھر بھی ہمیں اتنا خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ہمارے خلاف کوئی بڑا فیصلہ کر دیں گے کہ اچانک انہوں نے پھر غصے سے ہمارے سر کو گھورا اور جذبات میں بہہ کر ہمارے قتل کا حکم جاری کرتے ہوئے چلائے۔ "اوئے توں اپنے آپ نوں نہ صرف ساھڈے کولوں بہتا سیانا سمجھناں ایں بلکہ اپنا چٹیل سر وی ساھڈے ورگا بنا رکھیا ای"۔ اور اس کے ساتھ ہی جلاد کا ہاتھ حرکت میں آ گیا اور ہماری گردن تن سے جدا ہونے والے جھٹکے سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ اور ہماری جان میں جان آئی کہ "شکر ہے یہ محض خواب ہی تھا" ......!

دندان شکن

بتیس دانتوں کے اندر زبان رکھنا تو سنا تھا مگر یہ نہیں سنا تھا کہ یہ بتیسی اتنی طاقتور ہے کہ پورا کنبہ پال سکتی ہے۔جی ہاں دانتوں کے ڈاکٹر نے صرف دانتوں کے بیچوں بیچ زندگی کا معاشی رقص کرتا ہے۔مہنگائی کے دور میں قیمتیں بڑھ رہی ہیں، لیکن بتیسی کے دانت نہیں بڑھ رہے بلکہ مستزاد یہ کہ دانت کم ہو رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ڈینٹسٹ کے بھاگ بھی گہری نیند سوتے جا رہے ہیں۔فیس جتنی چاہے بڑھالیں گزارہ مشکل ہے۔ہاں اس کسمپرسی کو مصنوعی دانت لگانے کے کاروبار نے ذرا کم کیا ہے۔اور گرے ہوئے ایک دانت کی قیمت ہزاروں روپوں تک پہنچ چکی ہے۔اب اگر برش ایجاد نہ ہوتے تو شاید ڈینٹسٹ کو بھی دیگر ڈاکٹروں کی طرح نیویارک میں ٹیکسی چلانا پڑتی۔

ہمارے ایک جاننے والی ڈینٹسٹ صاحبہ اچھے خاصے مخمصے کا شکار ہیں یہ سننے کے بعد کہ جدید فیشن زدہ دنیا میں اب یہ تجویز زیرِ غور ہے کہ مرنے والے کا تابوت اس کے پیشے کا ہمشکل ہوگا۔دراصل ان کو یہ پریشانی لاحق ہے کہ ہارٹ سپیشلسٹ کے تابوت کی شکل دل جیسی یا آئی سپیشلسٹ کا تابوت آنکھ جیسا بنانا قطعی مشکل نہیں، لیکن ڈینٹسٹ کا تابوت اگر دانت کی شکل کا ہوا تو داڑھیں ناراض اور اگر داڑھ کی شکل کا ہوا تو اگلے دانت ناراض، اوپر والے کی شکل اپنائیں تو نیچے والے معترض۔خیر ہمارے خیال میں یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ جس کو حل کرنے کے لئے ایک دوسرے کے دانت توڑنے پڑیں یا کم از کم کھٹے کرنے پڑیں۔کیونکہ ڈینٹسٹ کا تابوت بڑے آرام سے فل بتیسی جیسا بنایا جا سکتا ہے۔

کسی نے ارسطو کا یہ قول دہرایا کہ عورت کے دانت مرد سے کم ہوتے ہیں تو ہمارے دوست ڈاکٹر زوبے (پولش زبان میں اس کا مطلب بھی دانت ہے) خاصے حیران ہوئے کہ اس قدر دانش مند انسان نے کبھی اپنی بیوی کا منہ کھول کر بھی نہیں دیکھا ہوگا۔کیونکہ مرد و عورت کے دانت برابر ہوتے ہیں۔ہوسکتا ہے ارسطو کی بیوی غیر معمولی طور پر اس قدر خاموش طبع رہی ہو کہ ارسطو کبھی اس کا منہ ہی نہ کھلوا سکا ہو۔مزید عین ممکن ہے کہ ارسطو کی دانش کی وجہ ہی شاید یہ ہو کہ کبھی اس کو بیوی سے تکرار نہ کرنی پڑی ہو جبکہ ہماری آدھی زندگی دفتر میں اور بقایا کی آدھی زندگی بیگم سے گفتگو میں بسر ہو جاتی ہے۔لہٰذا اسی تناسب سے ہماری دانش مندی بھی محض آدھی رہ گئی ہے۔

دانت نکالنا یا دانت دکھانا کوئی دانش کی علامت نہیں سمجھی جاتی جب تک کہ وہ درد و غم کی سٹیج پر نہ پہنچ جائیں۔اس لئے سمجھدار انسان پوری زندگی میں شاذونادر ہی ڈینٹل کلینک کا چکر لگاتا ہوگا۔لیکن شیطانی ذہن کا کیا کہنا کہ ایک بار کسی ڈینٹل ڈاکٹر صاحب کی بے جا مصروفیت کے باعث فرقت میں تڑپنے والی بیگم صاحبہ کسی غیر سے معاشقہ لڑا بیٹھیں۔موصوف عاشق نے طریقہ یہ اپنایا کہ ڈاکٹر صاحب سے ٹوکن لے کر کلینک میں بیٹھنے کی بجائے سیدھا ان کے گھر کی راہ لیتا۔جونہی راز کھلا تو شاید تبھی سے ٹوکن لینے کے بعد مریض کو کلینک میں ہی بٹھایا جاتا ہے۔

غذا اور صحت کے ماہرین اس نکتہ پر متفق ہیں کہ غذا کو خوب چبا کر کھائیں بلکہ ایک ایک لقمہ دانتوں کی تعداد کے برابر یعنی 32, 32 مرتبہ چبائیں ۔ ہمیں ذرا اس نکتہ دانش پر شک ہے کیونکہ یہ محاورہ بوڑھوں کے خلاف بنایا گیا ہے ۔ بوڑھوں کو کھانا زیادہ چبانے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ان کا ہاضمہ سست پڑ جاتا ہے ۔ اب اگر وہ اپنے دانتوں کی تعداد کے مطابق چبائیں گے تو چونکہ منہ تو خالی ہے پس سالم نگلتے ہی وفات پا سکتے ہیں ۔ یعنی یہ محاورہ بوڑھوں سے جان چھڑانے کا آزمودہ نسخہ ہی سمجھیں ۔ اب اسی محاورے کا غلط استعمال دیکھیں کہ ہمارے بھیا دوست ہر وقت جگالی کرتے نظر آتے ہیں ۔ استفسار پر فرمایا کہ چونکہ خوب چبانے کا حکم ہے اس لئے ہر وقت منہ میں کچھ نہ کچھ رکھتا ہوں تاکہ خوب چبا سکوں ۔ یہ کہتے ہی بائیں باچھ سے ذرا سی پیک لیک ہو جاتی ہے تو پھر محاورے پر عمل کی خاطر دوسرا پان منہ میں رکھ لیتے ہیں ۔

ہمارے ایک ماہر منشیات جو اب ماہر نفسیات کہلاتے ہیں ' نے ایک دفعہ اپنے اخبار میں لکھا کہ خوش خوراک دانتوں سے اپنی قبر کھودتے رہتے ہیں ۔ محاورے کی گہرائی اور گیرائی قابل رشک ہے ' مگر خوش فکرے ایک دوسرے دوست فرمانے لگے کہ چلو گورکن کا خرچہ تو بچا ۔ پھر سوال داغ دیا کہ کیا دانت اللہ نے محض برش کرنے کے لئے دیئے ہیں یا دوسروں کو محض چک کاٹنے کے لئے ۔ اگر یہ خوراک کو کھانے کے لئے ہیں تو ان کا بہترین مصرف یہ ہے کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے ہی رہیں ۔ ورنہ فارغ دانت تو صرف منہ چڑانے کے لئے ہی رہ جائیں گے ۔ یا پھر فارغ ہاتھ منہ خلال کرتے نظر آئیں گے ۔ چونکہ ہماری مصروف قوم کے دونوں ہاتھ ہر وقت مصروف رہتے ہیں یعنی ایک ہاتھ میں موبائل یا سگریٹ وغیرہ رہتے ہیں مگر دوسرا چہرے کے اردگرد منڈلاتا رہتا ہے ۔ یہ طواف ناک کرنے سے تو بہتر ہے کہ ہم خلال دانت کرتے رہیں ۔ خیر دانتوں سے قبر کھدوانے والی بات ملکی معیشت کی طرح نظر انداز کرنے والی چیز ہرگز نہیں ۔

لیکن اللہ کے کرم سے ہمیں نہ ملکی معیشت کی فکر ہے اور نہ تڑپ تڑپ کر مرنے کی ۔ کیونکہ معیشت کو ہم نے آئی ایم ایف اور دانتوں کو ڈینٹسٹ کے حوالے کر رکھا ہے ۔ وہ دونوں جب چاہیں ہماری معیشت کو داڑھ تلے داب لیں یا نہ چاہیں تو اپنے دانتوں کو ہماری معیشت کے حوالے کر کے غریبوں کی تکا بوٹی کر ڈالیں ۔

دانتوں کے بجنے سے سردی کی شدت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے ' لیکن اگر کوئی خچر ابوڑھا اپنی بتیسی میز پر رکھ کر سو جائے تو اس ٹیسٹ کو بھی ناکام کیا جا سکتا ہے ۔ بس اسی لئے اب دانتوں کے ڈاکٹر کوشش کرتے ہیں کہ فل بتیسی نہ بنائیں ۔ حالانکہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ پوری بتیسی کے اپنے فائدے ہیں ۔ پہلا فائدہ تو ہمیں اس وقت نظر آیا جب سامنے والوں کی بوڑھی ساس بہو کو صلواتیں سناتے سناتے تھک گئیں تو بتیسی اتار کر ہاتھ کی انگلیوں پر چڑھالی اور پھر کئی گھنٹے ہاتھ نچا نچا کر بہو کو زچ کرتی رہیں ۔ دوسرا واقعہ اس بوڑھے کا یاد آیا ہے کہ جو کئی ہزار روپے کی شرط صرف اس لیے جیت گئے تھے کہ وہ اپنے مصنوعی دانتوں سے اپنی آنکھ کو چک کاٹ سکتے تھے ۔ بتیسی کے کئی کراہت آمیز مناظر بھی ہماری یادداشت میں محفوظ ہیں ۔ یعنی ایک بڑھیا کو عادت تھی کہ پانی کے برتن میں بتیسی ڈبو کر رات کو فرج میں رکھ دیا کرتی تھی اور صبح لگا لیا کرتی تھی ۔ ایک روز فرج سے برتن اُٹھانا بھول گئی تو اس کی بیٹی نے غلطی سے وہی ٹھنڈا پانی ابا کو پیاس بجھانے کے لئے دے دیا ۔

ہمیں وہ وقت تو یاد نہیں جب ہمارے دودھ کے دانت گرے تھے۔ لیکن بڑھاپے کے دانت گرنے کے رقت آمیز مناظر خوب یاد ہیں۔ بلکہ اب تو لوگ ہمیں ہدفِ تنقید بنانے سے بھی ڈرنے لگ گئے ہیں کیونکہ اب ہم ان کو دندان شکن جواب دینے کے لئے ان کے سر میں زور سے بتیسی بطور ہتھیار مارنے کی صلاحیت سے بھی مالا مال ہو چکے ہیں۔

بعض بوڑھے جوڑوں کو آپس میں اس قدر محبت ہوتی ہے کہ وہ بتیسی بدل بدل کر باری باری کھانا کھاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے کفایت شعاری میں ہی ایک بتیسی خرید رکھی ہو' لیکن اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ بآسانی اپنی بات دوسرے کے منہ میں گھسا سکتے ہیں۔

دانتوں میں بوٹی پھنسی تو سبھی نے دیکھی سنی ہوگی مگر بوٹی میں دانت پھنسا کسی کسی نے دیکھا ہوگا۔ اس طرح کا سانحہ عموماً ان بچوں کے ساتھ پیش آتا ہے جن کے دانت گرنے کی عمر آ چکی ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں بڑے بوڑھوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ گرے ہوئے دانت کو بچہ اگر چھت پر کہیں دبا دے تو اللہ جلد ہی اس کو بھائی عطا کر دیتا ہے' لیکن ہمیں یقین ہے کہ یہ بات چالاک والدین کی ایجاد ہے کیونکہ بچے تو وہ خود لا رہے ہوتے تھے' بس بڑے منے میاں سے ذرا ضد کروا کر وہ احسان جتانے کے لئے اسے نئے مہمان کی آمد کی خبر دے کر شرمندگی سے بچے رہتے تھے۔ ایک دن منے میاں صبح اُٹھے تو ان کا ایک دانت غائب تھا۔ ابا نے اسے سمجھانے کے لئے کہہ دیا کہ بیٹا آپ کا دانت تو چوہا لے گیا۔ اگلے روز منے میاں بڑی مشکل سے ایک چوہا مار کر اس کا دانت نکال کر اپنا بدلہ اُتارنے کے لئے اپنے آپ کو لگاتے دیکھے گئے۔

ہم یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ اب موبائل کے بھی نیلے دانت یعنی بلیوٹوتھ ہوتے ہیں۔ یہ غالباً چغل خوری کی شاید کوئی قسم ہے کہ جس کی مدد سے ایک فون کی معلومات دوسرے کو چوری چھپے دی جا سکتی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ڈیجیٹل سائنسدانوں نے یہ ٹیکنالوجی محلے کی پھاپھاؤں کو دیکھ کر ایجاد کی ہوگی۔ فرق صرف اتنا رکھا ہے کہ فون سے صرف اصلی معلومات ہی منتقل کی جا سکتی ہیں۔ یعنی بلیوٹوتھ ہیرا پھیری کرنے سے یکسر قاصر ہے۔ جبکہ ہماری کپیسٹی اتنی وسیع ہے کہ نیلے دانتوں کی پوری بتیسی بھی ہمارے ڈرائیور اور کالونی کے نمازیوں کی انفارمیشن شیئر کرنے کی صلاحیت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

تھتھی جن دانتوں کو وہ کھاتی ہے اس سے کچھ کھا نہیں سکتی اور جن سے کھاتی ہے ان کو وہ کھا نہیں سکتی۔ یہ خوبی بھی اللہ نے حضرتِ انسان کو ودیعت کی ہے کہ اس کے ایک ہی جیسے دانت کھانے' دکھانے اور چڑانے کے کام آ سکتے ہیں۔ وگرنہ یہ کام ہاتھیوں کو کرنا پڑتا تو ان کو دانتوں پسینہ آ جاتا۔ ہمارے تایا حضور ہر کھانے کے بعد خاصی دیر تک جگالی کرتے رہتے تھے۔ ہم حیران ہوتے تھے کہ کھانا تو یہ کب کا کھا چکے ہیں' اور اب کیا چبا رہے ہیں۔ پوچھنے پر عقدہ کھلا کہ یہ دراصل ان کے دانتوں کے اندر بنے کھوڑوں کا کمال ہے جو کل لئے گئے کھانے کا کم از کم آدھا تو سٹور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

خیر دانت انسان کا حسن ہیں' چاہے مادھوری ڈکشٹ کے ہوں یا کھیل کے میدان والی چیئر لیڈرز کے۔ اس کا فائدہ ٹوتھ پیسٹ والی کمپنیاں یوں اٹھاتی ہیں کہ اشتہار میں ہیما مالینی کے دانت دکھا کر ٹیوب میں ایسی پیسٹ مہیا کرتی

ہیں کہ استعمال کے بعد انسان کا منہ پٹھانے خان جیسا ہو جائے۔ لاہور کے الحمرا ہال میں ایک بوڑھا گلوکار جب خوب زور لگا کر اپنی لے اُٹھاتا تو اُس کی بتیسی اکھڑ کر باہر آجاتی۔ وہ سیٹ کر کے پھر زور لگاتا تو پھر باہر آجاتی۔ ایک منچلے سے رہا نہ گیا تو زور سے پکارا خان صاحب گانا بھی سناؤ گے کہ کیسٹیں ہی بدلتے رہو گے۔ بعض لڑکیاں بھی جب مسکراتی ہیں تو کمپیوٹر کی سی ڈی کی طرح ان کی کیسٹ مسوڑھوں سمیت باہر آجاتی ہے۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ اس کیسٹ کی بناوٹ میں ان کا کیا قصور ہے؟

دانتوں کی عالمی کانفرنس کے موقع پر ہم دانتوں کا بزنس بڑھانے کے لئے یہ تجویز دینا چاہیں گے کہ کرکٹ یا ٹینس کی بجائے دنیا بھر میں باکسنگ کا کھیل بڑھانے کے لئے مہم تیز کی جائے۔ تاکہ ہر کھلاڑی کے دانت ٹوٹنا یقینی ہو جائیں۔ بعد میں حسب مقدور ڈاکٹر لاکھوں کا بزنس پا سکتے ہیں۔

ویٹرن ویٹرنری ڈاکٹرز

لاہور میں ہر سال کی طرح اس بار بھی جانوروں کے معالجین کا اجتماع بڑے دھوم دھڑ کے سے شروع ہوا۔ جس میں بہت سارے سابق معالجین حیوانات یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ حکومت نے ملک بھر میں بے حد و حساب ویٹرنری ڈاکٹر بنانے کے لئے بے شمار کالج کھول دیئے ہیں۔ اتفاق سے حالیہ برسوں میں شدید سیلاب نے لاکھوں جانوروں کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ لہٰذا اب ملک میں جانور اور ان کے ڈاکٹر لگ بھگ برابر ہو گئے ہیں۔ اس کا سہرا سابق گورنر پنجاب کے سر جاتا ہے جنہوں نے بے شمار سکولوں اور کالجوں کو یونیورسٹیاں بنا دیا تھا اور اسی عمل کے نتیجے میں معالجین حیوانات کی بھی باری آ گئی اور ایک لمحہ تو ایسا آ گیا کہ بے شمار بظاہر پڑھے لکھے وائس چانسلر بننے کے لیئے آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ اس منظر کو دیکھ کر حیوانات کی دنیا میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہو گی کہ ہماری گردن پر چلنے والی چھریوں کا استعمال حضرتِ انسان آپس میں ہی باہمی بھائی چارے کے طور پر جو کر رہا ہے تو شاید اسی طرح ہی ہماری جان بخشی رہے گی۔ حیوانات کے کئی کالجز میں ایسے ویٹرنری ڈاکٹر جو پہلے محض اپنے کلینک پر کسی بکرے کی چھینک کی باقیات بھی صاف کرنے کی زحمت گوارا نہ کرتے تھے اب بڑے طمطراق سے پرنسپل بن کر آس پاس دو گن مین بھی رکھنے لگ گئے ہیں۔ ممکن ہے انہوں نے اپنی ویلیوایڈیشن کے طور پر گن مین آس پاس سجا رکھے ہوں، لیکن درحقیقت حکومت نے وہ محافظ سرکاری خزانے کی حفاظت پر معمور کر رکھے ہوں گے کہ مبادا کہ موصوف اکاؤنٹ پر ہاتھ صاف نہ کر جائیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ قدرت نے حیوانات کے معالجین کی قدر و قیمت میں بھی خاصا اضافہ فرما دیا ہے حالانکہ بے چارے کئی معالجین اس قیمت کو وصول کر کے بھی وہم کا شکار ہیں کہ ہمیں کیسے مل گئی۔ کسی زمانے میں یہ معالج حکومت میں گریڈ سولہ نہ لے پاتا تھا مگر اب گریڈوں کو اس قدر نظر لگ گئی ہے کہ اکیسواں اور بائیسویں گریڈ بھی اس کی زد میں آ گئے ہیں۔ اب تو ان معالجین حیوانات کی اہمیت کا یہ حال ہے کہ کئی انسان بھی ویٹرنری ڈاکٹرز سے علاج کرانے لگ گئے۔ ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک صاحب جسم میں درد کی شدت سے کراہ رہے تھے کہ بیوی نے ڈاکٹر بلانے کا پوچھا۔ میاں نے پسلی پر ہاتھ رکھ کر شدتِ درد سے بیگم سے ڈنگر ڈاکٹر کو بلانے کا کہا تو محترمہ حیران رہ گئیں۔ استفسار پر میاں گویا ہوئے کہ دیکھو بھلی مانس ساری ساری رات اُلو کی طرح جاگتا ہوں۔ صبح سویرے گھوڑے کی طرح بھاگتا دفتر جاتا ہوں۔ سارا سارا دن گدھے کی طرح کام کرتا ہوں مگر پھر بھی میرا باس میری کتے جیسی عزت کرتا ہے۔ گھر واپسی پر بچوں کی چیخم دھاڑ سے ہاتھوں کے طوطے اُڑ جاتے ہیں اور پھر رات کو تم جیسی بھینس کے ساتھ سونا پڑتا ہے۔ بتاؤ اب بھی میرے لئے انسانوں کے ڈاکٹر کو بلاؤ گی؟

چلئے حضرات حالات جو بھی رہے ہوں کسی نہ کسی طرح جانوروں کے ڈاکٹر کی اہمیت تو بنی وگرنہ بھلے وقتوں میں تو بے چاروں کے پیشے کا سنتے ہی رشتہ ٹوٹ جایا کرتا تھا۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی ویٹرن وٹرنری ڈاکٹرز کے حالیہ اجتماع کی جہاں ایک ہی کینوپی کے نیچے جب سینکڑوں ڈاکٹر اکٹھے ہو گئے تو ایک ہل چل سی مچ گئی اور تو اور قدرت کو بھی ان کی یہ ادا نہیں بھائی اور طوفانی بارش قہر بن کر کینوپی بھی لے اُڑی۔ اس کے بعد سب مال کے سیانے یونیورسٹی کے ہال میں اکٹھے ہو گئے اور سب نے اپنا وہ روپ بھی دکھا دیا جس کی توقع کبھی قوم کے سرمائے یعنی سٹیج اداکاروں سے کی جاتی تھی۔ مزے مزے کے چٹکلے سُننے کو ملے اور تو اور سٹیج پر چند احباب سے اچھی انگریزی بھی سننے کو مل گئی بعد میں پتہ چلا کہ ان میں سے کوئی بھی ویٹرنری ڈاکٹر نہ تھا۔ آخر میں کھانے کا وہی حشر ہوا جو ہم متعدد بار میڈیکل ڈاکٹروں اور انجینئرز کی محفلوں میں ملاحظہ فرما چکے تھے۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ اجتماع خشک اور بور ہرگز نہ تھا خصوصاً جب ہم نے چشمِ تصور میں چند جانوروں کو آپس میں اپنے معالجین کے اوپر طعنہ زنی کرتے دیکھا۔

مثلاً اجتماعِ معالجین سے متاثر ہو کر اجتماعِ مریضاں بھی منعقد ہوا اور بہت سے جانور حضرتِ انسان پر ہنستے دیکھے گئے اور وہ تمام جانوروں والے کردار جو انسان نبھا رہا ہے ان کی بازگشت سنی گئی۔ گدھے نے ہرزہ سرائی کی کہ اسٹیشن پر انسان خود قلی بنا پھرتا ہے لیکن گدھا مجھے کہتا ہے' کتے نے شکایت لگائی کہ انسان خود بندوق اُٹھا کر مالک کے اردگرد رہتا ہے لیکن کتا مجھے کہتا ہے۔ مچھر بھی بھنبھناہٹ سے باز نہ آیا کہ جب گویا ہوا کہ حضرتِ انسان خود ایڈز پھیلاتا پھر رہا ہے لیکن ملیریئے اور ڈینگی کا الزام مجھ پر دھر رہا ہے۔ ہاتھی بھی حسد سے باز نہ آیا اور کہنے لگا کہ میں تو مر کر سوا لاکھ کا ہوتا ہوں مگر انسان کو دیکھو جو زندگی ہی میں بیمار ہو کر حکومت کے کئی لاکھوں روپے لے اُڑتا ہے۔ سب سے دلچسپ ریمارکس بکری نے کسے کہ بزدل مجھے کہتا ہے لیکن بیوی کے ناگوار تیور دیکھ کر کسی اور مقصد کے لئے اُبالے گئے پانی میں پتی ڈال کر چائے بنا لیتا ہے۔ لومڑی نے کہا کہ ہمارے معالج کو مال کا سیانا کہتے ہیں جبکہ وہ تو محض مال و دولت کمانے میں سیانا ہے۔ اونٹ بھلا کہاں چپ رہنے والا تھا کہنے لگا مجھے کینہ پرور مشہور کر رکھا ہے لیکن خود دوسروں کی مسجدوں میں بم پھوڑتا ہے۔ آخر میں تمام حیوانات نے متفقہ قرارداد منظور کی کہ حقیقت میں دنیا کی وحشی ترین مخلوق خود حضرتِ انسان ہے۔ جو اپنی ہی نسل کے دوسرے انسانوں کو ایسی ایسی اذیتیں اور تباہیاں تحفے کرتا ہے کہ جس کا کسی گھٹیا سے گھٹیا جانور نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔

ہمیں جانوروں کے انسانوں کے بارے خیالات جان کر دکھ تو بہت ہوا لیکن خوشگوار حیرت یہ ہوئی کہ امن پسند بے زبانوں کے معالجین پر اللہ کی طرف سے خصوصی رحمت ہے کیونکہ بے زبان کی دعا عرش سے ٹکرا جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ویٹرنری ڈاکٹروں کو بڑے بڑے گریڈ، عہدے وائس چانسلری اور پرنسپل جیسے عہدے' کئی ارب روپوں کی خصوصی رقومات و دیگر عنایات سوئے سوئے نہیں مل گئیں۔ انہوں نے محنت بھی جی توڑ کر کی ہے۔ بیوروکریٹس کے ذاتی لان تک میں خود گوڈی کرنے میں عار نہیں سمجھا۔ سال میں دو دو بار سیکرٹریٹ کے افسران کو اپنی ذاتی جیب سے جاڑے کے سوٹ عنایت کئے ہیں' اور سب سے بڑھ کر بے زبانوں کی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ اب دنیا جلے تو جلے لیکن جانوروں کی تعلیم کے ادارے اور ان کی پرورش کے محکمے بے حد پُرسکون اور سادہ لوح ہیں اور خاموشی سے حیوانات اور

اپنی ذات کی ترقی میں لگے ہوئے ہیں۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ جو کچھ افسران بالا پر خرچ کرتے ہیں اور نتیجے کے طور پر عہدے وغیرہ پاتے ہیں اس کو اپنی نوکری کے اندر ہی سے کماتے ہیں۔ ہاں ہر ایک کی طرح ان میں بھی انسان کی طرح کچھ کمزوریاں رہی ہوں گی جن پر گرفت کرنا مناسب اور قرین عدل نہیں۔ اگر کسی مجبوری کے باعث بے چارے ویٹرنری ڈاکٹر جانوروں کی نسلوں کو بڑھا نہیں پائے۔ دودھ گوشت میں خود کفالت نہیں لا پائے یا جانوروں کے علاج معالجہ میں کما حقہ کامیابی حاصل نہیں کر پائے تو پھر کیا ہوا۔ دوسروں نے کون سے تیر مار لئے ہیں؟ اب اگر وہ کچھ بھی نہیں کر پائے تو کیا بے چاروں کو یہ بھی حق نہیں کہ پی سی یا آواری میں سالانہ کانفرنس ہی کر لیں۔ چاہے اس کی فیس زبردستی شرکت کنندگان بھی نکلوا لیں۔ یہ معالجین حیوانات بھی آخر انسان ہیں کوئی جانوروں کے ساتھ مل کر جانور تو نہیں ہو گئے۔ مشتری ہوشیار باش۔

مسکراہٹوں کا عالمی دن

اکتوبر میں مسکراہٹوں کا عالمی دن منایا گیا۔دنیا میں بڑھتی آبادی، وسائل کی کمی اور دہشتگردی نے انسان کو غموں اور پریشانیوں میں اس قدر ڈبو دیا ہے کہ اب باقاعدہ طور پر اقوام متحدہ کو لوگوں سے درخواست کرنی پڑی ہے کہ کم ازکم ایک دن کے لئے ہی سہی ذرا ہنس لیں۔قہقہے لگائیں اور اگر دل روبھی رہا ہو تو کم ازکم اس دن بتیسی ضرور نمایاں کریں۔ہم نے بھی اپنے تئیں کوشش کرڈالی ہے کہ کسی منہ بسورتے ساتھی کو خوش کرنے کے لئے کچھ ایسے جتن کریں کہ اسکا دل باغ باغ ہوجائے۔ بلکہ اس کو دائمی خوشی مل سکے۔لیکن خوب سوچ سوچ کر بھی ایسی ترکیب سمجھ میں نہیں آئی کہ جس سے عوام کو مستقل خوشی مل سکے۔لہٰذا ہم نے سوچا کہ چلو عارضی طور پر ہی سہی ذرا دل پشوری کرلیا جائے۔یہ سوچ کر ہم نے ڈاکٹر خطائی سے سوال کرڈالا کہ بتاؤ بھائی آخر کتے شادی کیوں نہیں کرتے؟اور یہ جواب سُن کر ہماری ہنسی چھوٹ گئی کہ جب انہوں نے برجستہ جواب دیا کہ اس لئے کہ وہ تو بے چارے پہلے ہی سے کتے ہوتے ہیں۔اسی طرح ایک بار کتوں کی محفل چل رہی تھی تو بزرگ کتے نے سمجھاتے ہوئے نوجوان نسل کو مشورہ دیا کہ ارے کتو آپس میں محبت و پیار سے رہو ورنہ آدمی کی موت مارے جاؤ گے۔ایک اور موقع پر ایک تھنک ٹینک کتے نے اپنی قوم کو مشورہ دیا کہ جتنی جلد ہو سکے انسان کا جھوٹا کھانا بند کردو وگرنہ تمہارے اندر بھی انسانی خصائل پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہے۔اور پھر سمجھو کہ کُھلے سے مرنے کی بجائے بم دھماکوں یا خودکش حملوں سے مرا کرو گے۔

اب وقت کی تختی نے ہماری یہ حالت کردی ہے کہ لطیفے سے بھی ہنسی نہیں آتی۔کٹ کتاڑیوں سے بھی مدت ہوئی ہے ہنسی آنی بند ہوگئی ہے۔رہی بات چٹکلے لگانے کی تو بعض منہ ہی ایسے ہوتے ہیں کہ سنجیدہ ہوں تو ہنسی آنے لگتی ہے اور اگر ہنس پڑیں تو دیکھنے والے کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔سیاستدانوں کی بات جب بھی سُنیں تو ایک دوسرے کی مٹی پلید کرتے نظر آتے ہیں سوائے حافظ حسین احمد کے۔ان کی سیاسی پھل جھڑیاں اخبار کے اندر واحد ایسی لائنیں ہوتی ہیں کہ جنہیں پڑھ کر قتل و غارت کے باعث تنے ہوئے چہرے مُسکرا اٹھتے ہیں۔کبھی پیر پگارا اخبارات کے ذریعے سیاسی لطیفے ارسال کیا کرتے تھے مگر ان کی وفات سے اخبارات کی رونق بھی ختم ہو کہ رہ گئی ہے۔حکومت اکثر کوشش کرتی ہے کہ عوام کو مہنگائی میں ریلیف دے کر ان کے چہروں پر رونق لے آئے۔لیکن اس کے پاس بھی محض ایک ہی ترکیب ہے کہ پہلے پٹرول پانچ روپے لیٹر مہنگا کرلے اور پھر عوام کے چہروں پرخُوشی دیکھنے کے لئے دس پیسے قیمت کم کردے۔رہی ہماری عوام! تو اس کے خوش ہونے کا معیار بھی سب سے الگ تھلگ ہے۔اس کو بجلی جانے کی اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی بجلی آنے کی خوشی ہوتی ہے۔اور مہینے کے آخر میں گاڑی کی ٹینکی فل کروا کر محض اس لیے خوش ہو جاتے ہیں کہ کل سے پٹرول مہنگا ہو رہا ہے۔عوام تو اس روز بھی خوب خوش ہوتی ہے جب سی این جی سٹیشن کُھلتے ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ دس بیس

روپے لیٹر کی بچت کی خاطر ہزاروں روپے کا وقت لمبی لمبی لائینوں میں برباد کر دیتی ہے۔

اقوام متحدہ کی درخواست پر یوم مسکراہٹ منانے کے انداز بھی سب کے الگ الگ ہیں۔۔مثلاً صحافی قسم کے لوگ فاقے کی حالت میں پریس کانفرنس منعقد ہونے کا سُن کر خوش ہو جاتے ہیں۔دوکاندار قسم کے لوگ گاہکوں کو دھڑا دھڑ جعلی اور ملاوٹی قسم کے سودے خریدتے دیکھ کر خوشی سے پُھولے نہیں سماتے۔خاوند قسم کے لوگ خوشی کے مارے پانی اُبلنے بیٹھ جاتے ہیں وہ الگ بات ہے کہ بیوی کے تیور دیکھ کر اس میں پتی ڈال کے چائے بنا لیتے ہیں۔سائنسدان قسم کی مخلوق انٹرنیٹ سے نقل کر کے جعلی ریسرچ پیپر لکھ کر خوشی سے جھوم اُٹھتے ہیں۔جبکہ بیوی قسم کے لوگ بم دھماکوں کے بعد مرحومین کی فہرست میں خاوند کا نام تلاش کر کے خوش ہو لیتے ہیں۔ڈاکٹر قسم کے لوگ جعلی یا گھٹیا دوائی بنانے والی کمپنیوں سے گاڑی یا دیگر تحفے لے کر اتراتے پھرتے ہیں۔اور حکیم قسم کے لوگ اس بات پر خوش نظر آتے ہیں کہ سامنے والے میڈیکل سٹور سے بے شمار ایسی گولیاں مل جاتی ہیں کہ با آسانی پڑیاں بنا کر مریضوں کو مطمئن کر کے مال بنایا جا سکتا ہے۔میڈیکل ریپ قسم کے لوگ بے چارے نائی لگا کر ہی خوش ہو لیتے ہیں۔جبکہ اسی طرز کی خوشی ہوٹل کے بیروں کے حصے میں بھی آجاتی ہے۔مولوی قسم کے لوگ سارا غصہ لاؤڈ سپیکر پر نکال کر خوشی خوشی گھر کو لوٹ جاتے ہیں۔اور عادی نمازی فراغت کے بعد مسجد سے نکلتے ہی اہل محلّہ کی چغلیوں سے رانجھا راضی کر لیتے ہیں۔سٹوڈنٹ قسم کے لوگ روزانہ پانچ سو ایس ایم ایس کر کے خوشی خوشی سو جاتے ہیں۔جبکہ ٹیچر قسم کے لوگ نقل شدہ نوٹس بیچ کر خوشی خوشی اٹھلاتے پھرتے ہیں۔اکاؤنٹنٹ قسم کے لوگ جعلی بلوں سے حصہ وصول کر کے لیکن اعلیٰ درجے کے ٹیکس کنسلٹنٹ حصہ بقدر جثہ لے کر حکومت کی آنکھوں میں سُرخ مرچ ڈال کر خوش ہو لیتے ہیں۔ کالم نگار لفافہ لے کر اور ناول نگار رائلٹی لے کر خوش نظر آتے ہیں۔ہاں کچھ نیک قسم کے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اندرونی شرارت اور بیرونی خباثت چھپا کر خوش رہتے ہیں۔کچھ اپنے آپ کو حاجی کہلوا کر خوش ہو لیتے ہیں تو کچھ پروفیسر کہلوا کر خوش، کچھ ڈاکٹر کہلوا کر خوش، کچھ مولانا کہلوا کر خوش ،غرضیکہ خوشی کے بارے میں تو اب ایسا لگتا ہے کہ یہ بھی دو نمبر ہو کر رہ گئی ہے۔

ایسے میں اگر اقوام متحدہ لوگوں سے یوم مسکراہٹ منانے کا کہتی ہے تو یقین کریں بات دل کو لگتی ہے۔ہم نے جب اپنے بارے میں سوچا کہ ہم کس بات سے خوش ہوتے ہیں تو کافی حیرانگی ہوئی کیونکہ ہمارا معیار بھی تو کچھ عجیب سا ہے۔جس دن اخبار نہ آئے تو ہم خوش یا موبائل گھر رہ جائے تو مزید خوش۔نیند زیادہ آجائے تو ہم زیادہ خوش ہو جاتے ہیں۔حالانکہ دنیا میں حسبِ دستور قتل و غارت ہو رہا ہے مگر ہم بے خبری سے خوش ہیں۔دھڑا دھڑ فون بج رہے ہیں مگر ہم ڈھٹائی سے اٹینڈ نہ کر کے خوش ہیں۔عوام بھوکی مر رہی ہے لیکن ہم اپنے مدھر موسیقی والے ڈنرز پر خوش ہیں۔اور سب سے زیادہ خوشی تو ہمیں یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ ساری قوم نے کرکٹ میچ دیکھنے کے لئے بڑی بڑی سکرینیں لگائی ہیں مگر ذلت آمیز شکست کے خوف سے دورانِ میچ ہی ٹی وی بند کر کے چلتے بنتے ہیں۔

سب دِکھتا ہے

آج کالم لکھنے بیٹھے تو اخبار پر نظر پڑ گئی۔ پہلا صفحہ دیکھتے ہی اتنے میٹھے جھوٹ پڑھنے کو مل گئے کہ طبیعت شرارت پر اُتر آئی اور ہم نے فیصلہ کیا کہ گذشتہ کئی روز سے ذہن میں کلبلانے والے موضوع پر کالم بعد میں لکھا جائے گا۔ پہلے ذرا محض دو صفحات پر پھیلے میٹھے جھوٹوں کا میٹھے سچ سے جواب تو مسکت کیا جائے۔ تو ملاحظہ فرمائیے ملے جلے بیانات پر ہمارا تبصرہ۔ ہم نے جان بوجھ کر بیان دینے والوں کا نام نہیں لکھا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اہل نظر کو "سب دِکھتا ہے"۔

اخبار کا پہلا صفحہ:

☆"لوڈشیڈنگ کے جن کو قابو کرنے کا کوئی فارمولا حکومت کے پاس نہیں"

ہمیں حکومت میں شامل کر لیا جائے تو یقین کریں ہم زہر اگلنا بند کر دیں گے۔

☆"اگر فوج غیر آئینی حرکت کر کے اقتدار میں آئی تو عوام مذمت کریں گے"

بالفاظ دیگر فوج حکومت ہی میں رہے گی جس طرح عوام کی شدید مذمت کے باوجود ہم ابھی تک حکومت کے اندر ہیں۔

☆"اب بل دینے والا صارف ہی بجلی حاصل کرے گا"

یہ کمزور لوگوں کے لئے دھمکی ہے کہ انہیں بجلی بل ادا کر کے ہی ملے گی، طاقت ور لوگوں کو حسب سابق بل ادا کئے بغیر ہی بجلی ملتی رہے گی۔

☆"مشرف کے سابق حواری انہیں بچانے کے لئے میدان میں کود پڑے"

کیونکہ اہل نظر کی دور بین نظروں نے دیکھ لیا ہے کہ مشرف کو سیاسی ڈرائی کلین کرنے کے بعد باقاعدہ سیاست میں لا کر مُلک کی باگ ڈور سونپی جانے والی ہے۔

☆"بیوی سے علیحدگی کے بعد انگریزی بھول گیا ہوں"

اور اس کی موجودگی میں اردو بھول گیا تھا۔ لہذا نئی شادی اسی لئے نہیں کر رہا کہ لوگ مجھے گونگا سمجھ کے ہی اقتدار میں لے آئیں۔ پھر میں باقی حکمرانوں کی طرح انشا اللہ عوام کو بھی بھول جاؤں گا۔

☆"پیپلز پارٹی کے فیصلے اب بلاول ہاؤس لاہور سے ہوں گے"

یعنی فیصلے تو وہی کریں گے جو پہلے کرتے تھے فرق صرف یہ ہے کہ وہ اب دبئی کی بجائے لاہور میں بیٹھ کر فیصلے کریں گے۔

☆"کراچی میں پر تشدد واقعات سے مزید اسی افراد ہلاک"

اور تھر میں بغیر تشدد کے تین سو ہلاک۔

☆"سندھ جیو میرا ہاتھ تھام لو میرے جتنی جلاوطنی کسی نے نہیں کاٹی"

جلاوطنی کے صدقے میں صرف سندھی ہی میرا ساتھ دیں کیونکہ میں سندھ توڑنے کی طرف اشارہ کر رہا ہوں بعد میں سندھیوں سے بھی نبٹ لوں گا۔

☆"لوٹ مار کرنے والوں کو اُلٹا لٹکا دوں گا"

یار گھبرانا نہیں صرف دس منٹ اُلٹا لٹکاؤں گا۔ اور اس کے بعد آپ صدر، وزیراعظم، وزیراعلیٰ یا دیگر اہم عہدوں کے لئے کوالیفائی کر جائیں گے۔

☆"طالبان مذاکرات کے معاملے پر حکومت اور فوج ایک ہی صفحے پر ہیں"

اور وہ صفحہ قرطاسِ ابیض کی طرح بالکل صاف ہے نیز ہم نہ تو حکومت میں ہیں اور قسم سے ہمارا تعلق فوج سے بھی نہیں لیکن ہمیں پتہ سب کچھ ہے۔

☆"بڑے لوگ مشکل وقت میں گرین کارڈ جیب میں رکھ کر بھاگ جاتے ہیں"

اور چھوٹے لوگ مشکل وقت میں راشن کارڈ جیب میں رکھ کر مارے مارے پھرنے لگ جاتے ہیں۔ ☆"حکومت اور فوج کا قبلہ ایک ہے"

اُسی طرح جیسے ہر مسلمان بشمول طالبان کا قبلہ ایک ہی ہے۔

☆"سبزی منڈی دھماکے میں بم امرود کی پیٹیوں میں چھپائے گئے تھے"

دیکھا ہم نے بالآخر گہری تحقیقات کے بعد یہ راز کھول ہی دیا ہے کہ یہ چوری کسی چور ہی نے کی تھی۔

☆"بندوق سے غلبۂ دین ممکن نہیں دعوت تبلیغ سے امکان ہے"

لہذا ہماری درخواست ہے کہ راکٹ لانچر کو لوٹا سمجھ کر اس سے استنجا کیا جائے۔

اب اخبار کا آخری صفحہ:

☆"ملک کو ٹریک پر چلانا سیاستدانوں کے بس کی بات نہیں"

آپ سمجھ گئے ناں کہ اگر مارشل لا لگا تو میں وزیر اطلاعات ہوں گا۔

☆"پی پی، ن لیگ و دیگر جماعتیں گینگ ہیں یہ کہاں جمہوری نمائندہ ہیں"

یعنی جب تک موجودہ لفافے کی رقم میں خرچ نہیں کر لیتا اپنے بیان پر قائم رہوں گا۔

☆"پاکستان میں بھی صحافتی امور سرانجام دینا خطرے سے خالی نہیں"

لہذا کئی لوگ اس خطرے کو کاروبار سمجھ کر کر رہے ہیں۔

☆"حکومت ٹریفک وارڈنز کے متشددانہ رویئے کا نوٹس لے"

اور ہمیں آزادی دے دے تاکہ ہم سڑکوں پر اپنی مرضی سے اس طرح دندناتے پھریں جس طرح ڈاکو۔

☆"پنجاب بھر میں کالجز کے پروفیسر گریڈ 20 میں ترقی کے باوجود تعیناتی کے منتظر ہیں"

دراصل ان کا اپنا قصور ہے کہ کنجوسی کے باعث مال خرچ کرنے کو تیار نہیں۔

☆"ارباب اختیار قادیانت کے کینسر کو ختم کریں"

خدارا اس کو صرف بیان ہی سمجھیں، وگرنہ تو ہماری دکان کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

☆ ''بھارت میں عام آدمی پارٹی کے امیدوار بھی ارب پتی نکلے''

تو آپ کیا چاہتے کہ مینگو مین (عام آدمی) صرف پھٹی ہی کے پتی رہیں؟۔

☆ ''پنجاب میں پروفیسر، لیکچررز کی 5ہزار سے زائد سیٹیں خالی''

اور اس کے ساتھ شاگردوں کی بھی دو کروڑ سیٹیں خالی۔

☆ ''اوباش کی نوسالہ بچی سے زیادتی''

یہ تو بچی کا قصور ہے کہ وہ دو سال کی کیوں نہ تھی۔

☆ ''سادہ اہل کاروں کے ہاتھوں کارکنوں کا اغوا ہونا قابلِ مذمت ہے''

لہذا اگر وہ وردی پہن کر آئیں تو پھر بے شک ہمارے سارے کارکن گرفتار کرلیں ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

☆ ''بے قابو موٹر سائیکل کھمبے سے ٹکرا گئی''

یہ تو حکومت کی نااہلی ہے کہ جابجا کھمبے لگا رکھے ہیں۔

☆ ''شہد کی مکھیوں نے پانی وبجلی کے وزیر مملکت کے ظہرانے پر حملہ کر دیا''

اور پھر کھانا اچٹ جانے کے جرم میں پارٹی کارکنوں اور مکھیوں میں گھمسان کی لڑائی نیز وزیر موصوف نے میٹھی مکھیوں کی بے مثال سیاسی کارکردگی سے متاثر ہو کر انہیں پارٹی میں شمولیت کی دعوت دے ڈالی۔

☆ ''پی آئی اے کا طیارہ ریاض کی بجائے جدہ ائر پورٹ پر اتر گیا''

شکر ہے تھوڑا سا آگے بحیرہ احمر میں نہیں اتر گیا حالانکہ وہاں تک جانے کے لئے جہاز میں ایندھن بھی موجود تھا۔

☆ ''وزارتوں سے استعفے ایک ماہ قبل دیئے تھے حکومت سے الگ نہیں ہوئے''

یہ تو ہم محض اڑی کر رہے ہیں تاکہ ہمارا نان نفقہ بڑھایا جائے وگرنہ ماں سے جدا ہو کر بچہ بھوکا مر جائے گا۔

لٹنے والوں کی لوٹنے والوں سے فریاد

آج اپنا ای میل باکس کھولا تو اچانک کسی سحرش خان کی ای میل پر نظر پڑی، پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں اور ملک میں جاری لوٹ کھسوٹ کے ظالمانہ کھیل پر لعنت بھی بھیجنے کو دل نہ کیا۔ یہ ایک تھرڈ ائیر ایم بی بی ایس کی مظلوم بچی کا واویلا ان دس فی صد ظالم لٹیروں کے نام تھا جنہوں نے پیارے وطن کے نوے فی صد وسائل پر قبضہ جما رکھا ہے۔

پانچ بہنوں اور ایک بھائی کی وائٹ کالر فیملی کے سربراہ کو بنک آف پنجاب ڈیرہ غازی خان سے فارغ کرتے ہوئے ایک ٹرمی نیشن لیٹر تھما دیا گیا ہے کہ جاؤ ہمارے فلاں فلاں قانون کے تحت ہم تمہیں ملازمت سے برطرف کرتے ہیں اور وجہ بھی بتانے کے پابند نہیں۔ ٹرمی نیشن لیٹر کا مطلب ہے کہ تم آئندہ بھی کسی ادارے میں کام نہیں کر سکتے نہ تو یہ گریڈ ون افسر کوئی ہمیش خان ہے کہ جس نے بنک سے اربوں کا فراڈ کیا ہو اور نہ کوئی گن مین ہے جس نے کیش لوٹ لیا ہو۔ کوئی نالائق اور بے بھروسہ افسر بھی نہیں کہ جس سے بنک کا کام سنبھالا نہ جا رہا تھا۔ بلکہ عام سا محنت کش ہے جس کا صرف ایک جرم ہے کہ اس کے پیچھے کسی بڑی مچھلی کا ہاتھ نہیں ہے۔ محض 48 برس کی عمر میں ایم اے اکنامکس کی ڈگری گلے میں لٹکائے یہ بیس سالہ تجربہ والا افسر بیچارگی سے عدالت کے دروازے پر جا کھڑا ہوا ہے۔ اور غالباً نہیں جانتا کہ یہ وہ دروازہ ہے کہ جس کے باہر کھڑے خاک ہو سکتے ہیں اندر والوں کو خبر ہونے تک۔ تعلیم کی منازل کو ڈھیرے ڈھیرے طے کرنے والے پانچوں بچے آج باورچی خانے کے سامنے اداس بیٹھے ہیں۔ ماں منہ چھپا رہی ہے اور باپ کی زمین میں گڑھی نظریں اوپر کو اُٹھ نہیں پا رہیں۔ نصف ڈاکٹر بیٹی سحرش خان شاید مستقبل کے خوف کو بھانپ گئی ہے اور اپنی فریاد شریفانہ انداز میں شاید اس دس فی صد طبقے سے کر رہی ہے جس نے پہلے ہی اس جیسے نوے فی صد لوگوں کے وسائل کو چوس چوس کر اپنے پیٹ پُھلا رکھے ہیں۔ وہ آج دردمندوں سے قرض حسنہ مانگ رہی ہے نیشنل بنک سے اپنا وہ وظیفہ دوبارہ طلب کر رہی ہے جسے اچھے وقتوں میں اس نے باپ کے کہنے پر اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ شاید کوئی اور سحرش خان تعلیم سے محروم نہ رہ جائے۔ اور یہ بچی تعلیم جاری رکھنے کے لئے اس ظالم معاشرے سے اُدھار کی بھیک مانگتے ہوئے یقیناً ہچکیاں لے رہی ہو گی کیونکہ ظالم معاشرے کا میرے جیسا "ہمدرد" محض یہ سطریں لکھتے ہوئے اگر اپنی ہچکیوں پر قابو نہیں پا سکا ہے تو اس بے چارے سات افراد کی فیملی کے پیٹ میں تو بھوک بھی ہو گی۔

میرے سامنے اس معصوم بچی کی مدد کے تین راستے ہیں۔ اپنی جمع پونجی سے اسے قرض حسنہ دے دوں، یا اپنی کمپنی کے پاؤں پکڑ کر اس کے باپ کو نوکری دلوا دوں اور یا پھر میڈیا کے جس اخبار تک میری رسائی ہے اسی میں ایک کالم لکھ دوں کہ شاید کسی دردِ دل رکھنے والی کی نظر پڑ جائے۔ میں نے پہلا راستہ چند وجوہات کی بنا پر اختیار نہیں کیا۔ پہلی وجہ شاید یہ ہو کہ میرا شمار بھی لوٹ کھسوٹ کے اس معاشرے میں ظالم طبقے سے ہی ہو اور اگر میں نے خود ہی اس مظلوم بچی پر

زمانہ تنگ کیا ہوا ہے تو سلطانہ ڈاکو بن کر لٹنے والے کے ہاتھ پر لوٹی گئی رقم کس منہ سے پیش کروں؟ یا اپنی جمع پونجی کیوں کر محض ایک خاندان پر لٹا دوں جبکہ اس جیسے لاکھوں خاندانوں کو انہی تباہیوں کا سامنا ہے؟ دوسرا راستہ میں اس لیے اختیار نہیں کرنا چاہ رہا کیونکہ میں اپنی کمپنی میں پہلے بھی کئی بار اس سلسلے میں افسران بالا کے اس طعنے کا نشانہ بن چکا ہوں کہ جو میری سفارش پر مجھے کہتے ہیں کہ یہ تمہارا کوئی رشتہ دار ہے؟ میں کہہ تو سکتا ہوں کہ ہاں اس لٹی پٹی فیملی سے میرا گہرا رشتہ ہے کہ اسے میرے اور آپ جیسے ہی دس فی صد لوگوں نے سڑک پر لا کھڑا کیا ہے۔ لیکن یقین کریں میں یہ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں شاید خود بھی ان دس فیصد لٹیروں ہی سے تعلق ہونے کی وجہ سے اخلاقی جرأت بھلا کہاں سے لاؤں گا؟ اب سوچ سوچ کر یہ کالم لکھنے والا تیسرا راستہ اختیار کیا ہے اس امید کے ساتھ کہ شاید یہ فیملی کسی اور دردمند کی وساطت سے بچ جائے اور مجھے ''مفت'' میں ثواب ملتا رہے۔ اسی لئے سحرش خان کی ای میل کو میں نے اپنے کالم میں جگہ دے دی ہے۔
سن لو سحرش خان یہ بھی میرا تمہاری فیملی پر احسان ہے۔

میرا دل نہیں مان رہا کہ اخبار میں قوم کی بیٹی سحرش خان کا موبائل نمبر درج کروں۔ کیونکہ اس معاشرے سے اخلاقیات کی وفات بھی ہو چکی ہے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر درج کر رہا ہوں کہ اگر یہ خطرہ خود اس معصوم بیٹی نے مول لیا ہے تو کچھ سوچ کر ہی لیا ہوگا۔ اس کے موبائل کے نمبر ہیں 0334-0653827 اور 0334-0199852

میں معذرت خواہ ہوں کہ یہ کالم بیٹھے بیٹھے سچ سے کڑوے سچ میں بدل گیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسے کالم لکھ کر آپ کو غمزدہ نہیں کروں گا۔ اگلے کالم تک شاید آپ کو مسکرانے کے قابل کر سکوں پھر معذرت کیونکہ اس وقت تو میرا دل رو رہا ہے۔

قومی اسمبلی کرکٹ میچ

اخبارات کے مطابق سپیکر قومی اسمبلی ایاز صادق نے ارکان اسمبلی پر مشتمل ایک کرکٹ ٹیم بنانے کی تجویز دے دی ہے اور عابد شیر علی کو ذمہ داری دی ہے کہ وہ منجمنٹ میں بن جائیں اور تمام سیاسی جماعتوں سے کھلاڑیوں کی نامزدگی لے لیں۔ اس خبر کے ساتھ ہی بیٹھے بیٹھے کی چشمِ تصور کھل گئی ہے۔ اور منظر نامہ کچھ یوں ہو گیا ہے۔

انٹرنیشنل کرکٹ ایسوسی ایشن (آئی سی سی) نے دنیا بھر کے ممالک کی پارلیمان سے درخواست کی ہے کہ اپنے اپنے اراکین پارلیمان پر مشتمل کرکٹ ٹیمیں بنا کر ورلڈ کپ کے لئے حاضر ہو جائیں۔ T20 میچ کی پہلی اننگ 14 اگست کو لندن کے سرے محل کے خوبصورت لان میں کھیلی جائے گی۔ جبکہ دوسری اننگ 23 مارچ کو اتفاق محل کے جنت نظیر لان میں کھیلی جائے گی۔ نامزدگی کی آخری تاریخ تک دنیا کے 213 ممالک میں سے صرف پاکستان نے اپنے پارلیمنٹیرینز کی متحارب ٹیمیں بنا کر آئی سی سی کو نامزدگی روانہ کی ہے۔ جبکہ باقی کے 212 ممالک نے یہ عذر لنگ پیش کر کے ٹیم بنانے اور بھجوانے سے معذرت کر لی ہے کہ ابھی ان کے ہاں بہت سارا ترقیاتی اور غیر ترقیاتی کام کرنا باقی ہے ۔جس کے باعث ان کے پارلیمنٹیرینز فی الحال فارغ نہیں ہیں کہ وہ عوام کے ضروری مسائل حل کرنے سے قبل ہی کھیل تماشوں کی طرف توجہ کر سکیں۔ ان 212 ممالک کو آئی سی سی نے ڈرپورک، بزدل، نکمے اور نکھٹو قرار دیتے ہوئے ورلڈ رینکنگ سے خارج کر دیا ہے اور پاکستان کی حکومت اور اپوزیشن کی کرکٹ ٹیموں کو شاباش دیتے ہوئے ٹی ٹونٹی کے لئے طلب کر لیا ہے۔

ملک بھر میں اس اعزاز کو حاصل کر لینے پر شادیانے بج رہے ہیں۔ اور یقین سے کہا جا رہا ہے کہ کرکٹ کا ورلڈ کپ پاکستان ہی جیتے گا کیونکہ ن لیگ یا اپوزیشن میں سے جو بھی جیتے گا وہ پاکستانی اعزاز گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا جائے گا۔ ملک بھر کے تمام بڑے شہروں کے مرکزی مقامات یعنی لاہور میں مینارِ پاکستان، کراچی میں مزار قائد، پنڈی میں لیاقت باغ، فیصل آباد میں گھنٹہ گھر وغیرہ پر خوشحال عوام ٹماٹر جوس کے جام لنڈھاتے ہوئے اُمڈ پڑی ہے اور حکومت کا حوصلہ بڑھا رہی ہے کہ دونوں ٹیمیں جلد از جلد روانہ کریں کیونکہ ہم نے مندرجہ ذیل دس اہداف میں پوری دنیا کو مات دیتے ہوئے لازوال ترقی کر لی ہے۔ لہٰذا ہم اپنے دل کی تہوں سے حکومت اور اپوزیشن کی انتھک لیڈر شپ کو شب و روز کی بھرپور ترقیاتی محنت میں ذرا سکون کا سانس لینے کے لئے ادب اور پیار سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ عالمی سطح پر پاکستان کا تشخص کھیل کود اور ناچ گانا کر کے ضرور دوبالا کرے۔ ہماری دلعزیز حکومت نے جو دس ناممکن ترین اہداف حاصل کیے ہیں ان کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ

(1)۔ روپیہ ڈالر کے برابر کر دیا ہے۔

(2)-تمام عالمی اور ملکی قرضے ادا کر دیئے ہیں۔

(3)-ملک میں فی کس آمدن امریکہ سے تین گنا زیادہ کر دی ہے۔

(4)-عوام کی ضرورت سے زائد تمام بجلی گیس، پٹرول وغیرہ عالمی بھکاریوں یعنی امریکہ و یورپ کو بیچنا شروع کر دیا ہے۔

(5)-بارہ کروڑ نوجوانوں کو ملکی ترقی کے دھارے میں شامل کر لیا ہے۔

(6)-امن وامان، عدل اور ایمانداری حضرت عمرؓ کے دور جیسی کر دی ہے۔

(7)-ملک میں اصل خواندگی اور اعلیٰ تعلیم سو فی صد کر دی ہے۔

(8)-صحت کی مفت سہولیات شہر و گاؤں کے قریہ قریہ تک پہنچا دی ہیں۔ نیز تعلیم اور صحت کے لیے ملکی خزانے کے منہ کھول دیے ہیں۔

(9)-ملک بھر سے جاگیرداری اور سرمایہ داری نظاموں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے۔ اور

(10) بے شمار قدرتی وسائل کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے نیز ملک کی بے پناہ ترقی سے فائدے اُٹھانے کے لئے عوام سے درخواست کی ہے کہ وہ جلد از جلد آبادی دگنا یا تگنا کر لیں۔

آج پاکستان کی حکومت بمقابلہ اپوزیشن الیونز کے دوران ٹی ٹونٹی کی پہلی اننگز میں ن لیگ نے ٹاس جیت کر پہلے کھیلنے کا فیصلہ کیا ہے اور برطانیہ کے سرے محل کے خوبصورت لان میں جناب نواز شریف اور شہباز شریف اوپننگ کے لئے میدان میں اترے ہیں۔ اپوزیشن الیون کے زرداری صاحب نے پہلی گینداس طرح پھینکی ہے کہ نواز شریف آسانی سے چھکا لگا سکیں۔ لہٰذا انہوں نے زرداری کے پہلے اوور میں تین نوبالز ملا کر نو چھکے لگا کر دنیائے کرکٹ کا آج تک کا نیز مستقبل کے بھی ریکارڈ توڑ ڈالے ہیں۔ جس کی تصدیق سات امپائروں کی ایک معروف کمیٹی نے کر دی ہے۔ اس کمیٹی میں پی سی بی کے چیئرمین، گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ اور چار دیگر گروپس کے نمائندے بھی شامل ہیں یعنی میڈیا گروپ، ججی گروپ، فوجی گروپ اور بھارتی گروپ۔ ازاں بعد ساری اننگ میں دونوں اوپنر آؤٹ نہیں ہوئے اور دنیا میں ایک اور نیا ریکارڈ ٹرپل سنچریوں کا بنا گئے ہیں۔ نیز انہوں نے اپوزیشن الیون کے تمام باؤلرز کے دانت کھٹے کر دئے ہیں۔ ان باؤلرز میں گیلانی، پرویز اشرف، خورشید شاہ، بلاول، رحمان ملک، فضل الرحمان، عمران خان، الطاف حسین، اسفندیار ولی، پرویز الٰہی، سراج الحق، شیخ رشید، سمیع الحق کے علاوہ منجھے ہوئے امریکی باؤلر جنرل مشرف اور آزمودہ رنر طاہر القادری جیسے ورلڈ کلاس کھلاڑی شامل ہیں۔ اب اپوزیشن کی جوابی اننگ کے لئے دونوں ٹیمیں اگلے برس پاکستان کے اتفاق محلات کا دورہ کریں گی۔

حکومتی الیون کے ہزاروں رنز کا جواب دینے کے لئے اپوزیشن الیون کے زرداری اور الطاف حسین اوپننگ کے لئے آئے ہیں۔ حکومتی الیون کے عالمی شہرت یافتہ باولرز رانا ثناء، نثار احمد، ایاز صادق، ڈاکٹر ملک وافتخار چوہدری وغیرہ نے اپوزیشن الیون کا بھرکس نکال کے رکھ دیا ہے۔ ایک موقع پر تو یہ لگ رہا تھا کہ اپوزیشن شاید ایک رن بھی نہ بنا پائے لیکن ان کی پوری ٹیم بہر حال جان توڑ محنت کے بعد محض نو رن بنا کر آؤٹ ہوگئی اور یوں یہ میچ حکومتی الیون نے ہزاروں رنز سے جیت لیا ہے۔

آئی سی سی کے ساتوں غیر جانبدار ایمپائرز سے مشورہ لے کر حکومتی الیون کو ورلڈ رینکنگ میں پہلے نمبر پر قرار دے دیا گیا ہے۔اور چونکہ باقی دنیا بھر کی ڈرپوک ٹیمیں ترقیاتی کاموں کا بہانہ لگا کر شامل نہیں تھیں۔اس لئے اپوزیشن الیون کو دو نمبر قرار دے دیا گیا ہے۔ ایمپائرز کمیٹی میں شامل گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ والوں نے اعلان کیا ہے کہ ڈاکٹر نواز شریف دنیا کے پہلے بیٹسمین وزیراعظم ہیں۔اور رانا ثناءاللہ کو باؤلنگ میں پہلا نمبر عطا کیا گیا ہے۔ان کامیاب ترین سیاسی لیڈروں کی حوصلہ افزائی کے لیے یہ اضافی اعلان کیا گیا ہے کہ جب تک یہ حضرات زندہ رہیں گے ہر سال عالمی کتاب میں ان کے نام درج کئے جاتے رہیں گے۔ڈاکٹر نواز شریف کو ایک اور اضافی اعزاز یہ بھی دیا گیا ہے کہ ایک موقع پر جب بلاول زخمی ہو کر گرے تھے تو انہوں نے ڈاکٹر کا رول ادا کرتے ہوئے ان کی مرہم پٹی بھی کر دی تھی۔یہ انسانیت کی معراج ہے۔

بھارتی میڈیا پاکستان کرکٹ ٹیم کی یہ نیک نامی برداشت نہیں کر پا رہا ہے اور مسلسل اعتراض کر رہا ہے کہ حکومتی اور اپوزیشن ارکان پارلیمان کا مذکورہ میچ فکس تھا جس میں دنیا کے بڑے بڑے اور پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے کی قیمت لگا دی گئی تھی مگر سب کو معلوم ہے کہ جل کر اور ہار کر الزام لگانے والے کی بات میں کوئی وزن نہیں ہوتا۔

کل پاکستان غیر سیاسی مشاعرہ

ملک میں چند سیاسی اور غیر سیاسی سرگرمیاں کچھ اس انداز سے قلابازیاں کھارہی ہیں کہ لگتا ہے عنقریب نگران حکومت قسم کا ڈرامہ ظہور پذیر ہونے والا ہے۔ سیاستدان کسی اور کے دیئے ہوئے الفاظ اپنے منہ سے نکال رہے ہیں۔ فوج سرحدوں کی حفاظت کے علاوہ بھی کچھ کررہی ہے۔ امریکہ اپنے اُسترے تیز کر کے ان کو بھارتی وافغانی انی لگا رہا ہے ہر کوئی کچھ نہ کچھ کررہا ہے لیکن جو نہ کچھ کر رہا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی سُن رہا ہے وہ ہے عوام کا گروہ۔ اللہ کو بھی شائد یہی سب کچھ یا ذرا کچھ مختلف منظور ہے۔ یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کیونکہ جب تک ہمارے کرتوت سامنے نہیں آ جاتے ہم یہی کچھ کہتے رہتے کہ وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہوگا۔ اور جب اپنے کئے دھرے کا کڑوا پھل سامنے آتا ہے تو پھر بھی سر جھکا کر یہی کچھ کہتے ہیں کہ اللہ کو یہی کچھ منظور تھا۔ کاش اللہ کی مشیت میں یہ شامل ہوتا کہ جونہی ہم اپنے کرتوتوں کا الزام اس پر دھرتے تو وہ فوراً با آواز بلند دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیتا۔ لیکن اس کی اپنی بے نیازی ہے کہ اتنے کفر سُن سُن کر بھی غصے میں نہیں آتا۔ حالات کے ان کھلے رازوں کا ادراک ہوتے ہی ہماری میٹھے سچ کی چشمِ تصور کھل گئی ہے کہ جس میں ہم نے پاکستان میں ایک سیاست نُما غیر سیاسی مشاعرہ ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ چشم تصور بھی ایک عذاب ہے اور وہ معاملے بھی دیکھ لیتی ہے جو دُنیا ہم سے چھپانا چاہتی ہے۔

کراچی میں مزار قائد کے وسیع وعریض لان میں سامعین کھچا کھچ بھرے ہیں اور سیاسی وغیر سیاسی شعراء کی آمد آمد ہے۔ کوئی کلاہ پہن کر آ رہا ہے اور کوئی وگ لگا کر۔ کسی کے کپڑوں کا رنگ نیلا ہے کسی کا سرخ اور کسی کا سبز۔ مگر زیادہ تر اپنے اپنے علاقائی لباسوں میں ہی ہیں۔ عوام کو انتظار کے کرب سے بچانے کے لئے سٹیج سے شیخ رشید پھل جھڑیاں چھوڑ رہے ہیں۔ نیز قومی ترانے بھی نشر کئے جارہے ہیں۔ بادی النظر میں یہ کوئی جنگی سین نظر آرہا ہے۔ صدر مجلس آرمی چیف ہیں اور انتظام وزیراعظم کے ہاتھ میں ہے۔ سٹیج سیکریٹری جیو تیز ہے۔ مشاعرے کے منصفین کافی سارے ہیں جن میں افتخار چوہدری نمایاں نظر آرہے ہیں۔ امن وامان طالبان کے ہاتھوں میں ہے۔ جبکہ نغمے تحریکِ انصاف اور ایم کیو ایم کی طرف سے بجائے جارہے ہیں۔

مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی کی غزل کا عنوان اللہ رسول ہے، حافظ سعید کا صحابہ، فضل رحمان کا اقتدار، پی پی کا کرپشن، ایم کیو ایم کا بھارت، نون لیگ کا میڈیا، تحریک انصاف کا آرمی، ق لیگ کا ماضی کے سپنے، سُنی تحریک کا کلاشنکوف، اے این پی کا ریلوے، عوامی تحریک کا کینیڈین شہریت، جماعت اہل حدیث کا ڈنڈا، اور مشرف پارٹی کا امریکہ ہے۔ سبھی سیاسی وغیر سیاسی شعرا عوام کی طرف توجہ کئے بغیر اپنے من پسند منشوری کلام سنا رہے ہیں۔ لیکن ایک درخواست سب کی مشترک ہے اور وہ یہ کہ آخر میں ہر کوئی عوام سے قربانی ضرور مانگتا ہے۔ ہمیں مشاعرہ سُنتے ہوئے

محسوس ہو رہا ہے کہ سامنے سامعین میں عوام نہیں بلکہ قربانی کے بکرے ہیں۔ جو ہر سیاسی کلام کے بعد قربانی کی درخواست پر یوں تالیاں پیٹ رہے ہیں۔ جیسے وہ قربانی کے معنی نہیں جانتے۔ بالکل ایسے ہی جیسے بکرے کی اداس اور ویران آنکھوں کو دیکھ کر محسوس نہیں ہوتا کہ وہ بیچارہ گنا و ے اور گوبر میں فرق کر سکتا ہو گا۔ اور اگر اس کی آنکھوں کے سامنے چُھری بھی لہرا دی جائے تو اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے نہیں لہراتے۔ بلکہ وہ اس چھری کو یوں گھور کر دیکھے گا جیسے اس کے سامنے پنکھے لہرائے جا رہے ہوں۔

سب اپنی اپنی باری پر اپنی منتخب شدہ غزلیں گا کر رخصت ہو رہے ہیں۔ یہ کم کم ہی ہوتا ہے جو آج ہوا ہے کہ آرمی چیف نے بھی گلا صاف کرتے ہوئے اپنے کلام سے عوام کو لطف اندوز کیا ہے۔ چونکہ سب اپنی بولیاں بول چکے ہیں لہٰذا اب اس غیر سیاسی مشاعرے کے جج کی طرف سب کی نظریں لگ گئی ہیں۔ اور سب بے تابی سے ججوں کی جانب دیکھ رہے۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ منصفِ اعلیٰ کو قومی مسائل اور قومی شعراء کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے ہی لئے گئے بے شمار سوموٹو ایکشن میں اس طرح پھنس چکے ہیں کہ ان کے پاس اجتماعی قومی مسائل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا وقت ہی نہیں ہے۔ بالآخر میڈیا کے شور مچانے پر وہ طوعاً کرہاً اپنی نشست سے اٹھتے ہیں اور بے دلی کے ساتھ جلدی جلدی اس غیر سیاسی مشاعرے کا مختصر سا فیصلہ سُنا کر عوام سے تفصیلی فیصلے کے لئے وقت مانگ لیتے ہیں۔ جس کے اعلان کی ذمہ داری انہوں نے جناب آرمی چیف پر ڈال دی ہے۔ آرمی چیف اپنی مسند سے کھڑے ہوتے ہیں اور بہترین غزل کے اعلان کی ذمہ داری پنٹا گون پر ڈال دیتے ہیں۔ پنٹا گون کے نمائندے کو جب آن لائن لینے کا انتظام کیا جاتا ہے تو وہ تھوڑا سا وقت یہ کہہ کر مانگتے ہیں کہ ذرا بھارت اور اسرائیل سے بھی مشورہ کر لیا جائے تو بہتر ہو گا۔ کیونکہ اس طرح دُنیا کا امن پہلے سے بہتر ہو سکتا ہے۔

اس کل پاکستان غیر سیاسی مشاعرے میں سب سے وحشتناک حالت عوام الناس کی ہے۔ اُسے نہ صرف غزل سنانے کا موقع فراہم نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اس فیصلے میں بھی شامل نہیں کیا گیا ہے کہ وہ کون سی بہترین پارٹی ہے جسے آئندہ حکومت دی جائے گی۔ عوام کا نمائندہ شاعر ہونقوں کی طرح کبھی سٹیج کی جانب دیکھتا ہے اور کبھی عوامی سیلاب کی جانب۔ اور یوں پلکیں جھپکاتا ہے کہ جیسے اُلو کو اچانک سورج کے سامنے بٹھا دیا گیا ہو۔ اچانک عوامی شاعر چھلانگ لگا کر سٹیج پر چڑھتا ہے اور مائیک پر چلا کر یہ شعر پڑھتا ہے۔

میری کشتی ڈبویں کس طرح   یہ مشورہ ہے ناخداؤں میں

گولیاں کھاتے رہیں گے

ایسا لگتا ہے کہ ہمارے بہادر صحافی نے پچھلے دنوں جان بوجھ کر گولیاں کھائی ہیں تبھی تو وہ اب عادی گولی خور سلطان راہی کی طرح غراتے ہوئے کہتے پھر رہے ہیں کہ میں آئندہ بھی گولیاں کھاتا رہوں گا۔ یہ الگ بات ہے کہ ساتھ ہی غیر ارادی طور پر پشت پر ہاتھ رکھ کر پسینے پسینے بھی ہو جاتے ہوں گے۔ ابھی کل ہی جب ہم نے مُنے میاں کو ڈانٹا کہ بیٹا زیادہ میٹھا مت کھاؤ اس طرح دانت خراب ہو جائیں گے تو اس نے اکڑ کر کہا آپ کر لیں جو کرنا ہے میں تو گولیاں کھاتا رہوں گا۔ گو کہ یہ کہتے ہوئے مُنے میاں نے غیر ارادی طور پر اپنے گال پر ہاتھ بھی رکھ لیا کہ مبادا چانٹا ہی نہ پڑ جائے۔ لیکن ہمیں اس کی بہادری پر رشک آنے لگ گیا۔ ایسا ہی ایک واقعہ ہمیں پچھلے برس کا یاد ہے کہ جب ہم چچی جان کی تیمارداری کے لئے گئے تو انہوں نے پانستان کی دو گولیاں منہ میں پھینکتے ہوئے بڑی بے چارگی سے کہا کہ بیٹا جب تک آرام نہیں آجاتا لگتا ہے میں گولیاں کھاتی رہوں گی۔ یہ کہتے ہی انہوں نے بے خیالی میں گردے پر اس طرح ہاتھ ٹکالیا کہ جیسے انہیں ٹھیک ہونے کی بالکل اُمید نہیں تھی۔ اور اب دیکھیں ہمارے گھر کی جانب کہ جس میں چوہے دندناتے پھر رہے ہیں۔ اب ملاوٹ کا زمانہ اس حد تک چھا گیا ہے کہ چوہے گولیاں بھی کھاتے رہیں گے اور پھر موٹے بھی ہوتے رہیں گے۔ ہاں کبھی کبھار وہ بے دھیانی میں ہمارے چھوڑے ہوئے سری پائے کھا کر وفات بھی پا جاتے ہیں۔ ان سارے واقعات سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر کوئی ہمیں گولیاں بھی کراتا رہے اور ہم اسے بے چوں و چرا کھاتے بھی رہیں تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم خاصے احمق واقع ہوئے ہیں۔ ورنہ اگر گولیاں دینے والوں کو پہچان جائیں تو کم از کم انکی گولیاں کھاتے تو نہ رہیں۔

گولیاں کھانے سے ہمیں اپنے اس عظیم کلاس فیلو کی یاد آگئی کہ جس نے میٹرک پاس نہ کر سکنے کی کوفت سے بچنے کے لئے اچھی خاصی نیند کی گولیاں کھالیں۔ چونکہ وہ اگلی صبح اُٹھ نہ سکا تھا ورنہ وہ بھی شاید یہی کہتا کہ میں تو گولیاں کھاتا رہوں گا۔ یہ گولیاں بھی عجیب چیز ہیں اگر گڑ سے بنی ہوں تو باآسانی کھائی جاسکتی ہیں۔ شیشے کی ہوں تو کھیلی جاسکتی ہیں۔ خواب آور ہوں تو نگلی جاسکتی ہیں۔ بھانے باز کے منہ سے نکلیں تو باسانی ہضم کھایا جاسکتا ہے لیکن اللہ توبہ۔ اگر سیسے کی بنی ہوں تو انہیں چکھنے سے قبل ٹارزن کا حوصلہ، بے وقوف کا کلیجہ، خاوند کا ارادہ، سیاستدان کا وعدہ، سلطان راہی کا گنڈاسا ضرور موجود ہونا چاہئے اگر یہ سارا سامان نہ بھی ہو تو کم از کم اور کچھ نہیں تو جاگتے ہوئے خواب دیکھنے کا ملکہ تو حاصل ہونا چاہئے۔ یہ تو ہمارے غیور اور نڈر بھائی کا کمال ہے کہ کچھ گولیوں کو پنڈلیوں پر سسکی لئے بغیر سہہ گئے وگرنہ کسی ماہر نشانہ باز کی محض ایک درست گولی سے اگر غبارے سے ہوا نکل جاتی تو کم از کم ٹائمز آف انڈیا کو بہت افسوس ہوتا۔ کیونکہ ان کے بارہ برسوں کے لگے ہوئے سرمائے سے جو بھٹہ خشت لگایا گیا تھا وہ پورے کا پورا بیٹھ جانے کا اندیشہ

تھا۔مزید براں ان کی آشا کی تلاش کے لئے اب کسی اور در کو کھڑ کھڑانا پڑتا۔

ہمارے ایک پڑھے لکھے سابقہ ڈائریکٹر جنرل نے گورے کو یہ سمجھانے کے لئے کہ باہر گولی چل گئی ہے لہٰذا دفتر بند ہے کا فون پر یوں ترجمہ کیا کہ "آفس از کلوز ڈیو ٹو بلٹس آر واکنگ آن دی روڈ"۔اس پر ہم اس سوچ میں پڑ گئے ہیں کہ اگر ہمارے صحافی دوست کو یہی بات کہ "ہم گولیاں کھاتے رہیں گے" انگریزی میں کہنی پڑتی تو شاید ٹائمز آف انڈیا کو بھی دانتوں پسینہ آجاتا۔کیونکہ اگر وہ یہ کہتے کہ "آئی ول بی ایٹنگ دی بلٹس" تو ہوسکتا تھا انگریز کو پیچش لگ جاتے۔اور اگر یوں بولتے کہ "آئی ول بی فیسنگ دی گنز" تو شاید خود ان کو مروڑ پڑنے لگ جاتے۔ایسے وقت میں تو اللہ توبہ کرنی چاہئے اور ایسے بول منہ سے نہیں نکالنے چاہئیں کہ مبادا اگلی بار ٹو پی ڈرامے کی بجائے کہیں اصل ڈرامہ نہ آن اثر ہوجائے کہ جس میں کسی اناڑی کے ہاتھ سے چلائی گئی بغیر آنکھوں والی گولی نہیں بلکہ مشتاق نشانچی کے ہاتھوں سے سنساتی ہوئی سیسے کی گولی "بلو کے لک" سے دوفٹ نیچے کی بجائے کہیں دوفٹ اوپر جالگتی تو پھر بلّو پریس کانفرنس میں اعلان کرتی پھرتی کہ ہم گولیاں کھاتے رہیں گے۔ایسا تو منے میاں سے بھی ہو چکا ہے کہ جب انہوں نے گولیوں سے منہ بھر بھر کر ناشتہ کرنا شروع کردیا تو ایک روز کئی چوہے اس کے کئی دانت لے گئے۔عینہ چچی جان پانستان کی گولیاں کھاتے کھاتے بالآخر دائمی آرام والی وادی میں اتر گئیں تھیں۔یہی الفاظ سب سے موٹے چوہے کے بھی تھے جو اگلے ہی روز بھی کڑکی میں آگیا تھا اس لئے کہ صاحب خانہ نے کڑکی میں روٹی کے ٹکڑے کی بجائے میٹھی زہریلی گولی پھنسا دی تھیں۔ان تمام عبرتناک واقعات سے لرزتے ہوئے ہم اپنے صحافی دوست سے دست بستہ عرض کرتے ہیں کہ بھائی عقل کو ہاتھ ماریں اور گولیاں کرانے والے کو پہچان جائیں اور پھر انہیں کھاتے رہنے سے بھی باز آجائیں کیونکہ اب ہم میں کسی کی جدائی سہنے کی سکت نہیں رہی اور یہ نہ ہو کہ پاکستان کے ساتھ ساتھ بھارت اور بنگلہ دیش کی دو ارب آبادی کی ساڑھے تین ارب آنکھ بھی اشکبار ہوجائے۔

ان گولیوں کے ذکر سے ہمیں یہ بات سوجھی ہے کہ اگر ہم اس موضوع پر کوئی فلم بنانا چاہیں تو شاید اس ساری فلم میں ہیرو ہی ہیرو ہوں گے اور تماش بین محض عوام ہی ہونگے۔اس فلم کا نام ہوگا "تیری گولی میرا لک" اس مووی میں چند ایک سُپر ہیروز بھی ہوسکتے ہیں اور آپس میں مدِمقابلہ بھی ہوسکتے ہیں۔مثال کے طور پر چند سُپر ہیروز تو یہ ہوں گے۔جنگ بمقابلہ ٹائمز آف انڈیا، نواز شریف بمقابلہ نریندر مودی، حامد میر بمقابلہ ہنس راج ہنس، امن کی آشا بمقابلہ میڈ ان انڈیا۔یا پھر بُل فائٹر بمقابلہ اللہ میاں کی گائے، بنگالی ایوارڈ بمقابلہ پنجابی جوگاڑ وغیرہ۔اس فلم میں البتہ کچھ چھوٹے چھوٹے مقابلے بھی دکھائے جاسکتے ہیں۔جیسے کہ گائے کے دودھ اور اس کے پیشاب میں مقابلہ۔ماتھے کا تلک بمقابلہ کلنک کا ٹیکہ۔وینا ملک بمقابلہ اسد خان۔لالی وڈ بمقابلہ بالی وڈ۔وسیم اکرم بمقابلہ شسمیتا سین۔موسٹ فیورڈ نیشن بمقابلہ ٹاٹا پارٹنر شپ۔ادھر کا نصاب تعلیم بمقابلہ اُدھر کا نصاب تعلیم یا پھر امن کا پہاڑ سیاچن بمقابلہ صحافیانہ ضد یعنی امن کی آشا وغیرہ وغیرہ۔

اللہ میاں کی گائے بمقابلہ بُل فائٹر

حافظ حسین احمد صاحب نے پاک بھارت وزرائے اعظم کو مزاحاً اللہ میاں کی گائے اور بُل فائٹر کے خطابات سے نوازا ہے۔ ہم شروع ہی سے حافظ صاحب کی بذلہ سنجی کے معترف ہیں کیوں کہ وہ بہت خوبصورتی سے میٹھا سچ بول جاتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ دونوں وزرائے اعظم اپنے آپ کو ملنے والے ان خطابات کو کڑوا سچ سمجھ کر منہ پھیر لیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ ایک کا چہرہ غصے سے لال ہو جائیگا اور دوسرا زیرِ لب مسکرائے گا۔

ہمیں حافظ صاحب کی اس ترکیب میں البتہ کچھ نقص نظر آیا ہے اس لئے ذرا ان سے پوچھنا چاہیں گے کہ بُل فائٹر تو بُل یعنی بپھرے ہوئے بیل کو دھوکے سے گراتا ہے اور فاتح قرار پاتا ہے کیونکہ مست بیل سُرخ کپڑا دیکھ کر بپھر جاتا ہے۔ لیکن اگر بُل فائٹر کے مقابلے پر بپھرے ہوئے بیل کی بجائے محض ایک ٹھنڈی ٹھار گائے آجائے جو پہلے ہی سے جُھک جُھک کر فرشی سلام کر رہی ہو۔ تو یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس گری گرائی گائے کو مزید گرانے کے لئے بُل فائٹر کیا ترکیب استعمال کرے گا؟ ہمارے خیال میں مذکورہ بُل فائٹر پھر بھی ضرور سُرخ جھنڈی دکھائے گا، تاکہ ٹھنڈی ٹھار گائے کے اندر ذرا گرمی بھر جائے۔ ذرا ٹھہریے یہ ترکیب بھی شاید درست نہیں ہے۔ کیونکہ گائے میں گرمی بھر جانے سے تو کہانی کا رُخ پرورشِ حیوانات کی جانب مڑ جائے گا۔ لہٰذا یہ معاملہ بھی نہیں چلے گا۔ ہاں اس بات کا ہلکا سا امکان ہے کہ حالات کچھ اس طرح کے بن جایں کہ بُل فائٹر خود ہی شرم کے مارے منہ کے بل گر پڑے۔ درحقیقت بُل فائٹر تو تمام تیاریاں بپھرے ہوئے نوجوان اور ظالم نر بیل کو مات دینے کے لئے کرتا ہے۔ اگر حالات یوں ہوں کہ وہ رنگ میں اترے اور اپنے مقابلے پر ایک نرم سی ادھیڑ عمر اور شریف مادہ گائے کو پائے تو خاصے امکانات ہیں کہ شرم سے ہی ڈوب کر مر جائے۔ جیسا کہ ایک بار شیر کے ساتھ ہوا تھا۔ بادشاہ سلامت بے خبر سو رہے تھے کہ ان کو کوئی چوہا کاٹ کر بھاگ گیا۔ ہڑبڑا کے اُٹھے اور ایک قہر آلود دھاڑ نشر کرنے کے لیے ابھی منہ کھولا ہی تھا کہ اس بلونگڑے سے چوہے پر نظر پڑ گئی۔ اُن کو یقین ہی نہ آیا کہ یہ بے قدر مخلوق اس قدر جرأت کر سکتی ہے۔ بس ساتھ ہی شرمندگی سے گر کر بے ہوش ہو گئے۔ اگر اس طرح کا واقعہ آن اثر ہو جائے تو سمجھ لیں گائے جیت گئی۔

حافظ صاحب والی ترکیب معروضی حالات کے لحاظ سے بھی ذرا اُلٹی نظر آتی ہے۔ پڑوسی ملک میں بیل ذبح نہیں کئے جاسکتے اس لئے اُسے ہم گائیوں والا ملک کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ گائیوں کے ساتھ رہ رہ کے نر بیل بھی گائے جیسے بن جاتے ہیں۔ ادھر ہمارے ہاں تمام بیل ذبح کر دیئے جاتے ہیں لہٰذا ہم بھی گائیوں والی سرزمین ہی ٹھہرے۔ چونکہ دونوں پڑوسیوں کے پاس بھینسے نام کی چیز ہی کوئی نہیں تو بُل فائٹنگ کیسی؟ اور اگر بُل فائٹنگ نہ ہو تو بُل فائٹر بھی مشکل ہی سے ملے گا۔ یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ ہم دونوں پڑوسی ممالک محض سپین جیسا خوبصورت، امیر اور امن پسند ملک بننے کی خاطر

بپھرے ہوئے بھینسے اور بُل فائٹر درامد کر کے رانا مشہود کی طرح اپنا نوابی شوق پورا کرتے رہیں۔ بس اس لحاظ سے بھی حافظ صاحب کی چوٹ حالات سے مَس نہیں کھاتی۔

حافظ حسین احمد چونکہ ذہین شخصیت ہیں اس لئے یوں لگتا ہے کہ ان کا اشارہ حالات کی طرف ہرگز نہیں ہے بلکہ شاید واقعات کی طرف ہے۔ کیونکہ ماضی میں البتہ ایسے کئی واقعات ہو چکے ہیں کہ ایک حضرت کئی بار جغادری بُل فائٹر کی طرز کا کردار ادا کر چکے ہیں جبکہ دوسرے صاحب بھی معصومیت کے کئی لازوال عالمی نمونے پیش کر چکے ہیں۔ گجرات میں قتلِ عام اور لندن کے میثاق جمہوریت جیسے واقعات ابھی پرانے نہیں ہوئے۔ جب ایک جانب بُل فائٹر صاحب نے شہر بھر میں آگ بھڑکا دی تھی مگر دوسری جانب اللہ میاں کی گائے نے میثاق پر دستخط کر کے پہلی باری مخالف پارٹی کو تھما دی تھی۔ اوّلا ذکر کو تو حالات نے ہیرو اور پردھان منتری بنادیا او مسند اقتدار بخش دی ہے۔ جبکہ ثانی الذکر دستخط فرمانے سے اگلے چھ برس تک کر محروم اقتدار رہے۔ اُن دنوں چونکہ بلی کہیں دور وادیوں میں سیر کرنے گئی ہوئی تھی لہذا چوہے ناچ ناچ کر مدت بھی پوری کرتے رہے اور بلی کا مزاق بھی اڑاتے رہے۔ اب اللہ اللہ کر کے جب معصوم میاں کی باری آئی ہے تو لگتا ہے بلی واپس آرہی ہے۔ بس وہ اب ڈرے ڈرے سے رہتے ہیں اور جلدی جلدی میں دنیا بھر میں جہاں بھی ان کا کاروبار ہے وہیں اکثر و بیشتر دورے پر جاتے رہتے ہیں۔ کیونکہ معلوم نہیں کب چیف ایگزیکٹو سے ایم ڈی بننا پڑ جائے۔

ہم معذرت چاہتے ہیں کہ اکثر میٹھی میٹھی باتیں لکھتے ہوئے ہمارا قلم سیاسی آلودگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ بس ہم واپس آتے ہیں حالات کے میٹھے جبر کی طرف۔ پڑوسی بُل فائٹر جو پہلے عوام کو سُرخ جھنڈی دکھا کر بپھرنے پر مجبور کرتا رہا تھا اب دھوکہ دے کر بالاخر بپھرے ہوئے بھینسے یعنی عوام کے کندھوں پر چڑھ دوڑا ہے۔ اب اسے ڈر لگ رہا ہوگا کہ اگر اس بپھرے ہوئے بھینسے نے اُسے پٹخنی دینے اور سینے پر زوردار ٹکر رسید کرنے کے لئے اچھل کود کا اودھم مچا دیا تو کوئی ہڈی پسلی سلامت رہنے کی امید باقی نہیں۔ لہذا اسے اب اپنی جان، آن اور شان بچانے کے لئے آہستہ آہستہ اللہ میاں کی گائے بننا پڑے گا۔ جبکہ دوسری جانب حافظ صاحب جنہیں اللہ میاں کی گائے کہہ رہے ہیں اُسے اپنی شان، آن اور ''جان'' بچانے کے لئے ہنگامی طور پر بُل فائٹر بننا پڑے گا۔ چونکہ دونوں جانب معاملہ ذرا اُلٹا ہوتا نظر آ رہا ہے تو اس لیے نجم سیٹھی کی چڑیا نے کہا ہے کہ جسے حافظ صاحب اب تک بُل فائٹر سمجھ رہے تھے اُسے اللہ میاں کی گائے بننا پڑ گیا ہے اور جسے اللہ میاں کی گائے سمجھا جا رہا تھا اسے بُل فائٹر جیسا رول ادا کرنے کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ لیکن اگر موجودہ بُل فائٹر اللہ میاں کی گائے بنے گا تو اپنی مدت پوری نہ کر سکے گا۔ اور اگر موجودہ اللہ میاں کی گائے اُچک کر بپھرے بیل پر چڑھنے کی بجائے بارہ کروڑ کی بی ایم ڈبلیو میں جا گھسی تو بھی شاید مدت پوری نہ کر پائے۔ اب دیکھتے ہیں دونوں کے اونٹ کس کروٹ بیٹھتے ہیں؟

بیس کروڑ سر برائے فروخت

مہنگائی کا اس قدر زور ہو گیا ہے کہ ابھی کل کی بات ہے کہ کیمسٹری میں ایم ایس سی سابق گورنر سٹیٹ بنک اور اس وقت کے صدر پاکستان نے منتخب وزیراعظم کو کرپشن کا طعنہ دے کر رخصت کرتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان کی ساری پارلیمنٹ کو محض ایک ارب روپے میں خریدا جا سکتا ہے۔ہم نے یہ خبر یورپ میں پڑھی تو جیب پر ہاتھ مارا مگر سوائے چند سو ڈالروں کے ہمارے پاس کچھ نہ تھا۔ہم دل مسوس کر رہ گئے کہ کاش ہم نے تحصیل علم کی حماقت کے بجائے مال و زر اکٹھا کرنے جیسا شریف کام کیا ہوتا تو پارلیمنٹ کے خریداروں میں شامل ہو جاتے۔پھر کوئی دو دہائیاں ہی گزری ہوں گی کہ ہمارے ایک سرمایہ دار وزیراعظم نے ملک کے تین چار موقر اداروں میں محض تین چار ارب کی سرمایہ کر کے پوری حکومت خرید ڈالی۔ہم پھر دل گرفتہ سے رہ گئے کیوں کہ اس بار بھی دو نمبر کام نہ کرنے کی پاداش میں ہمارا اکاؤنٹ ویسے ہی خالی تھا جس طرح بیس کروڑ عوام کے سر اندر سے خالی ہیں اور حکمرانوں کے اوپر سے۔بظاہر ہم بنک کے اکاؤنٹ ہولڈر تھے لیکن بنک میں رقم کم ہونے کے باعث ماہانہ جرمانہ ادا کرتے رہتے تھے۔بالکل ایسے ہی جیسے دنیا کی واحد اسلامی ایٹمی طاقت کے پاس سروں کی فصل تو تیار ہے مگر اندر سے خالی ہونے کے سبب کوئی کاٹنے کو تیار نہیں ہے۔اور خریداروں کی تلاش کے ٹینڈر کینیڈا سے آرہے ہیں۔

پچھلے بیس برسوں میں تو مہنگائی محض تین گنا ہی بڑھی تھی لیکن اگلے تین برسوں میں مہنگائی میں قدرا ضافہ دیکھنے کو ملا ہے کہ اب چھ ارب فیس لے کر ایک صاحب دیار غیر سے اپنے آبائی ملک پر حملہ آور ہو کر انقلاب کی آڑ میں حکومت خریدنے آرہے ہیں۔جبکہ آگے حالت یہ ہے کہ بے خبر اور معصوم خادم اعلیٰ نے گھبرا کر اپنا استعفیٰ دینے کی بجائے پٹرول بم سے استعفیٰ لے لیا ہے۔اب کے بار ہماری مالی حالت گو کہ پہلے سے خاصی بہتر ہے مگر پھر بھی بیس کروڑ خالی سر خرید نے کے لئے آٹھ دس ارب روپے تو ایک طرف آٹھ دس لاکھ بھی نہیں ہیں۔ہمیں اپنے حالات پر رہ رہ کر غصہ آرہا ہے ہم نے اس روپے پیسے کی دنیا میں کیا کمایا ہے؟ جب کار محض ایک لاکھ کی تھی تو ہمارے پاس محض دس ہزار تھے۔ہم نے زور لگا کر بنک میں ایک لاکھ روپیہ اکٹھا کیا تو پتہ چلا کہ کار چار لاکھ کی ہو چکی ہے۔ازاں بعد اندر کھاتے کئی دو نمبر کام کرنے کے بعد جب دس لاکھ اکٹھے کئے تو موئی کار پندرہ لاکھ کی ہو چکی تھی۔اس ستم ظریفی پر ہم مایوسی کے سمندر میں غوطے لگانے ہی والے تھے کہ تھے کہ ایک روز کسی مولوی کی تقریر سنی تو ڈھارس بندھی۔موصوف پھٹے پرانے بدبودار کپڑوں میں ملبوس ہو کر امیروں کو کوسنے دیتے دیتے یہاں تک کہہ گئے کہ امیر جنت کی خوشبو تک نہ سونگھ سکے گا۔لہذا اس دنیا میں کسمپرسی کی زندگی بسر کرنے والوں کا ہی جنت پر قبضہ ہو گا۔چونکہ ہم نے دینی معاملات مولویوں کے حوالے کر رکھے ہیں اس لئے اگلے جہاں میں جنت کی بشارت پا کر مطمئن ہو گئے۔لیکن اُن کی بات چونکہ موجودہ جہان کے علوم سے ٹکرا رہی

تھی لہذا ان سے اختلاف کر کے ہماری اس روز مسجد میں کافی درگت بنی جب بے ساختہ ہمارے منہ سے یہ نکل گیا کہ
پھر تو سارے غریبوں کو جلد از جلد وفات پا کر جنت پر قبضہ کر لینا چاہیئے کہ کہیں وہاں بھی ان کو سستی روٹی کی لائنوں میں
لگ کر دھکے نہ کھانے پڑیں۔

خالی سروں کے حوالے سے ہمیں ایک واقعہ یاد آ گیا ہے۔ایک بار عالمی منڈی میں سروں کی قیمت لگ رہی تھی
جہاں پر ہر کسی کا سر سستا اور سردار جی کا سب سے مہنگا قرار پایا۔ اکنامکس کے اصول کے مطابق وجہ صرف یہی تھی کہ ہر
شخص کے سر میں دماغ موجود پایا گیا لہذا دماغ ڈیمانڈ سے زیادہ سپلائی ہو جانے کے باعث بے حد سستے قرار پائے۔جبکہ
سردار جی کا دماغ صرف اس لئے مہنگا رہا کہ ہر دسویں سر سے ایک دماغ برامد ہوا۔اگر دوبارہ سے ایسی منڈی وجود میں
آ گئی تو لگتا ہے کہ ہم سے مہنگا دماغ شاید کسی کا بھی نہ ہو کہ ساٹھ برسوں سے دنیا کی مارکیٹ میں ہمارے سر توڑے جا
رہے ہیں لیکن ابھی تک ایک دماغ بھی برامد نہیں ہو پایا۔عین ممکن ہے کہ دنیا کی غالب طاقتوں نے ہمارے "درامدی
مولانا" کو موجودہ فیس ادا کرنے کے علاوہ مزید اربوں روپے محض اس تحقیق پر لگا دیئے ہوں کہ ڈھونڈ و شاید کہیں سے
دماغ برامد نہ ہو جائے اور اگر ہو گیا تو وہیں دفن کر دینا مبادا اس واحد اسلامی ایٹمی مملکت کو کوئی اور مہاتر محمد نہ مل جائے۔
جوں جوں ہمارے سر خالی اور دماغ قیمتی ہوتے جا رہے ہیں توں توں ملک میں انقلاب کے چانس بڑھتے جا رہے ہیں۔
کیوں کہ انقلاب کے مقاصد اور اہداف صرف لیڈر ہی کے علم میں ہوتے ہیں اور باقی کا بے دماغ ہجوم صرف زور لگانے
کے لئے ہوتا ہے۔کوئی بعید نہیں کہ محض موجودہ ہوشربا مہنگائی کے باوجود کوئی قائد ایسا انقلاب برپا کر ہی ڈالے جو محض چھ
ارب روپے میں بیس کروڑ سروں کی قیمت لگا کر یہ حکم صادر کرے کہ جھک جاؤ زمینی خداؤں کے سامنے ایک کروڑ
نمازیوں کی شکل میں تاکہ میں اللہ کے حضور سرخرو ہو کر یہ کہہ سکوں کہ دیکھا کیسا "چکاوا" دیا ہے پوری قوم کو میں نے۔اور
بیس کروڑ سروں کو یوں جھکا دیا ہے کہ ہر کوئی اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ میرا رب خوش رہا ہوگا۔لیکن یہ تو چند ماہ بعد ہی
منکشف ہوگا کہ رب کا تو ابھی پتہ نہیں کہ خوش ہوا ہے کہ نہیں البتہ زمینی خدا بہت خوش ہوئے ہیں یہ جان کر کہ ان بیس کروڑ
سروں والی قوم کے چالیس کروڑ ہاتھوں کو اپنے چالیس کروڑ پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے نہایت مکاری سے اور نئے
سرے سے سوپچاس سال پیچھے کر دیا گیا ہے۔بالکل ویسے ہی جیسے ستر کی دہائی میں نوستاروں کے قومی اتحاد سے فیصل آباد
کے سلطانی مٹھائی شاپ والے کے نوجوان بچے نے جب "کافر" بھٹو کے خلاف "جامِ شہادت" نوش کیا تو اس کا باپ
فرط جذبات سے یہ نعرے لگاتا ہوا گھر سے نکلا کہ میں ایک شہید کا خوش قسمت باپ ہوں۔پھر اس کی چند ہی برس میں کمر
دہری ہو گئی اور اس نے اپنی حیاتی میں ہی دیکھ لیا کہ ان نوسواروں کی کار میں امریکی پٹرول ڈالا گیا تھا۔لہذا جونہی وہ نوفلمی
ستارے سانجھی کار سے اتر کر اپنی الگ الگ سائیکل پر بیٹھے تو پتہ چلا کہ سب کی سائیکلوں کے کتے فیل ہو چکے ہیں۔

تو قدر دانو! بات ہو رہی تھی مہنگائی کی۔اس دور میں چھ ارب روپے میں بھی اگر حکومت مل جائے تو ہمارا خیال
ہے گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔کیونکہ بیس کروڑ سروں سے مغز اور لہو چوس کر بڑے آرام سے چھ سو ارب روپے مزید بنائے
جا سکتے ہیں۔رہ گئے بیس کروڑ منہ تو ان کا فٹے منہ کرنے کے لئے ان کو لالی پاپ کے طور پر چوسنے کے لئے مذہب کا نعرہ
دیا جا سکتا ہے۔جس کو "بکری عوام" نہایت عقیدت سے اگلا انقلابی نعرہ ایجاد ہونے تک چوستی رہے گی۔خیر مذہب کے

نام پرتو بے شمار لیڈروں نے کھربوں نوٹ چھاپے ہیں۔اور یہ ایک سدا بہار کاروبار ہے۔لیکن اس کے علاوہ بھی کے پر فریب لالی پاپ ہم مدتوں سے چوستے رہے ہیں۔اور وہ ہیں غربت سے نجات،فرقہ پرستی کے خلاف جہاد، دہشت گردی،تبدیلی اور اب لیجئے صاحبانِ ذوق نیا لالی پاپ یعنی انقلاب۔اب اس کو چوسیں تاکہ چند درجن خاندان مزید کھرب پتیوں میں شامل ہوسکیں۔

؎ میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہن ہوئے ہیں دستانے

فادر ڈے۔۔۔والد کی تلاش کا عالمی دن

پچھلے دنوں پاکستان میں بھی فادر ڈے منایا گیا۔اس بار رنگ ذرا پھیکا تھا اس لئے کہ میڈیا کے بعض چینلز پر پابندی کے باعث عوام کو یورپین بنانے کے مشن میں ذرا رکاوٹ آ گئی تھی۔وگرنہ ہر ابو کو بچوں سے ابو ہی کے پیسوں سے گفٹ ملتے۔بچے بے چارے من کے سچے ہوتے ہیں اس لئے ان کو بے راہرو کرنے کا بہترین وقت وہی ہوتا ہے جب وہ ابھی سنِ بلوغت سے گزر رہے ہوں۔میڈیا پر بعض پابندیوں کے اس بار کئی مثبت پہلو بھی دیکھنے کو ملے۔یعنی اس سال بچے کافی حد تک فادر ڈے جیسے جراثیمی حملے سے محفوظ رہے۔بالکل ویسے ہی جیسے ڈاکٹروں کی ہڑتال والے دن ہلاکتیں کم ہوتی ہیں حالاں کہ یہ کمی کافی حد تک فیس بک نے پوری کرنے کی کوشش کر ڈالی اور بے شمار ''بچے'' فیس بک پر اپنے فل ٹائم ابوؤں کو تہنیتی پیغامات ارسال کرتے پائے گئے یہ جانے بغیر کہ یہ رسم یورپ وغیرہ میں اس لئے منائی جاتی ہے کہ وہاں لگ بھگ ستر فی صد بچے نہیں جانتے کہ ان کے ابا کون تھے اور کہاں ہیں؟اور باقی تمیں فیصد اٹھارہ سالہ ہو جانے کے باعث اپنے مستقل اور عارضی ابوؤں سے دور زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اس موقعے کی مناسبت سے ہمیں جناب فیض احمد فیض کا مشہور شعر پھر یاد کر کے پیروڈی کرنے کا بڑا مزہ آ رہا ہے۔یعنی

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا ''ابو'' تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

اس پیروڈی میں ''لہو'' کو ابو بنانے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ وہاں اگر کسی مرد کو یہ خبر ملے کہ وہ ابو بن گیا ہے تو اس کی آنکھوں میں لہو اتر آتا ہے۔ہمیں وارسا شہر میں گزرا ایک واقعہ یاد آ گیا ہے۔ہوا یوں کہ ہمارے پاکستانی دوست کا ہمیں گھبرایا ہوا فون آیا کہ میری موجودہ گرل فرینڈ نے ہسپتال میں ایک حرامی کو جنتے ہوئے اس کے باپ کے نام کے طور پر میرا نام لکھوا دیا ہے۔وہ قسمیں کھا رہا تھا کہ وہ ہرگز اسکا بچہ نہیں ہے بلکہ وہ تو پہلے سے ہی حاملہ تھی۔خیر ہم نے موقع کی مناسبت کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہوئے اسی پر حملہ کر دیا کہ ''چل پتر ہور چوپ گنے''۔کر بندوبست 18 سال اس بیگناہ روح کی کفالت کا۔

یہ واقعہ سن کر ہمارے سفارتخانے کے ایک اعلیٰ مگر نوجوان افسر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔حالانکہ یہ غالباً رونے کا مقام تھا۔تمسخر کی وجہ دریافت کرنے پر فرمانے لگے کہ یہ پاکستانی احمق واقع ہوا ہے۔میری نوکرانی جب ہسپتال میں میرا ہی بچہ جننے لگی تو محض ایک ہزار ڈالر بروقت اس کی مٹھی میں دبانے پر اس نے والد کے خانے میں اپنے پڑوسی کا نام لکھوا دیا۔یہ دونوں واقعات جب ہم نے اپنے ایک سادہ لوح بزرگ کو سنائے تو وہ ہکا بکا رہ گئے اور ہم سے

پوچھنے لگے کہ ان دونوں لڑکیوں نے اپنے اصلی خاوندوں کے نام کیوں نہیں لکھوائے؟ لوکر لوگل۔ جنریشن گیپ۔ یہ تینوں واقعات سن کر میرے ایک مولوی دوست خاصی دیر تک تو جھینپتے رہے۔ لیکن آلے دوالے دیکھ کر آخر ہمت کر کے پوچھنے لگے کہ اس سے تو ایسا لگتا ہے کہ مغرب میں کافی لوگ حرام کی پیداوار ہوں گے؟ ہائے ربا۔ کتھوں لبھے ابا۔ مولوی جی رہے سادہ کے سادہ۔ بالکل اس سردار جی کی طرح کہ جنھوں نے سمندر کے کنارے ایک ننگ دھڑنگ حسینہ کے سن باتھ لیتے دیکھا تو چپکے سے اس کی سائیکل چرا کر بھاگ نکلے۔ سامنے سے آتے دوسرے سردار کو دیکھ کر اسے اپنی ذہانت کا قصہ جب سنایا تو وہ بولا ''اچھا کیتا ای اوہدے کپڑے نہیں چرائے او وہ تینوں کوئی پورے آونے سن'' (اچھا کیا اس کے پاس پڑے کپڑے نہیں چرائے۔ وہ تمہیں کوئی پورے آنے تھے؟)۔

خیر ہم واپس آتے ہیں مغرب میں ابو کی تلاش گمشدگی کی طرف۔ وہاں تقریباً ہر بچے کو اپنے ابے، دادے اور پردادے کی تلاش ہے جس کو انہوں نے اکٹھا ایک ہی دن منانے کا نام ''فادر ڈے'' رکھ لیا ہے۔ چونکہ اس طرح کی چیزیں اگر گم ہو جائیں تو یقین کریں ہماری پولیس بھی برآمد نہیں کر سکتی۔ حالانکہ وہ ڈی ایس پی کی گھڑی ہاتھی سے برآمد کر سکتی ہے اور ہاتھی خود ڈرائنگ روم کی سیر کے بعد بلک بلک کر کہہ رہا ہوتا ہے کہ میں چور آں، میں چور آں (میں چور ہوں)۔

اگر ہمارے سیاستدان یورپ میں بھی حاکم ہوتے تو فادر ڈے پر شاید اس طرح کے بیانات دیتے۔ رحمان ملک نے گمشدہ ابو کا نوٹس لے لیا ہے۔ سابق چیف جسٹس افتخار چوہدری نے تمام ابوؤں کے خلاف سوموٹو ایکشن لے لیا ہے۔ صدر زرداری نے گمشدہ ابوؤں کی شناخت کرانے کی شرط پر وعدہ کیا ہے کہ آیئے آپ کو بیوی سے جان چھڑانے کے 101 نسخے سستے داموں بتادوں۔ عمران خان نے حرامی نسلوں کی بجائے ان کے ابوؤں کو سونامی میں غرق کرنے کی دھمکی دی ہے۔ شہباز شریف نے ہر گمشدہ ابو کی فیملی کی کفالت کے لیے پانچ پانچ لاکھ روپے امداد کا اعلان کیا ہے۔ نواز شریف عنقریب گمشدہ ابوؤں سے خطاب کرنے یورپ کا دورہ کریں گے۔ شیخ رشید، پرویز الٰہی اور ڈاکٹر شیر افگن نے جنرل پرویز مشرف کا نام بھی گمشدہ ابوؤں کی لسٹ میں ڈال دیا ہے۔ امریکہ نے ابوؤں کی تلاش میں مدد دینے کی شرط پر طالبان کو معافی دے دی ہے۔ الطاف حسین چونکہ گوروں کے بیچ رہتے ہیں اس لیے اس موضوع پر روشنی ڈالنے سے صاف انکار کر گئے ہیں اور رہے شیخ الاسلام طاہر القادری تو انہوں نے فادر ڈے کے حق میں ووٹ دے دیا ہے کیونکہ ان کو اپنی شہریت قائم رکھنے کے لیے کینیڈا والوں کے اس رواج پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اب آیئے رانا ثناء اللہ کی طرف۔ تو استعفیٰ کے بعد چونکہ ان کو جگت بازی سے ذرا فرصت مل گئی ہے اس لئے وہ بہت سے گڑھے ابو کنگھال کر نکال ڈالیں گے۔

جہاں تک الیکٹرانک میڈیا میں فادر ڈے منائے جانے کا تعلق ہے تو ان کی کی ایک مجبوریاں ہیں۔ ۲۴ گھنٹے کی نشریات کو پورا کرنے کے لیے ان کو بہت سے موضوعات چاہئیں۔ کہیں سبقت کی خواہش تو کہیں انوکھے خیالات کی پیدائش کا شوق۔ اس پر مستزاد سٹاف بیچارا تعلیم و تربیت اور شعور سے خاصی حد تک فارغ۔ نیز کہیں کہیں غیر ملکی ہدایات بھی رقم کے عوض ماننی پڑتی ہیں۔ اب بیچارے خیالات درامد نہ کریں تو نوکری سے فارغ۔ اور اگر بڑھ چڑھ کر بونگیاں عوام الناس تک نہ پہنچائیں تو سمجھ لیں کہ روزی روٹی کے لالے۔ نہ بیچاروں کے پاس قومی پالیسی اور نہ دینی علوم۔ لے

دے کے نقالی ہی واحد فصل رہ گئی ہے کہ جس کو جی بھر کے کاٹتے رہتے ہیں۔تبھی تو کبھی مغرب سے امی کا دن پکڑ لاتے ہیں تو کبھی ابے کا۔اور پھر دو رکی کوڑیاں بجا بجا کر اپنے بیہودہ اور لغو افکار کی سند پاکستانی معاشرے کے حقیقی اور جذباتی رشتوں سے جوڑتے رہتے ہیں۔مثلاً کہتے ہیں کہ ماں اور باپ بڑے مقدس ہیں اس لیے ان سے محبت کرنی چاہیے۔بھائی یہ کونسی انوکھی بات ہے۔ہم کونسا مغرب کی طرح 364 دن ماں باپ سے دور جنسی گلچھرے اڑانے کے بعد ایک دن کے لیے پاس آ کر ان کے چرنوں میں لیٹ جاتے ہیں۔ہمارے والدین تو ہر وقت ہماری آنکھوں کے سامنے رحمتیں بکھیرتے رہتے ہیں۔ہمارا ہر دن فادرڈے اور ہر رات مدرڈے۔

پاکستان میں فادرڈے منا کر آپ اڑائیں بھلے سے مغرب کا مذاق۔لیکن یقین کریں ہمیں مغربی یتیموں پر خاصہ ترس آتا ہے کہ بے چارے ابو دیکھے بنا بھی پہاڑ جیسی زندگی گزار کے مزید ایسے بے شمار بچے پیدا کر رہے ہیں جن کو ان کی آئندہ نسلیں بھی فادرڈے پر اسی طرح ڈھونڈیں گی جیسے وہ خود اپنی زندگی میں اصل ابے کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے بوڑھے ہو گئے ہیں۔

کولمبو یونیورسٹی

ہمارے میٹرک کے دور میں جعلی سندوں کے حوالے سے کولمبو یونیورسٹی بہت مشہور ہوئی تھی اور اس کا مالک جب پکڑا گیا تو بہت سارے سرکاری افسران نے مل کر اس کو چھڑانے بلکہ اسے غائب کرانے کی کوشش کر ڈالی تا کہ ان کی نوکریاں نہ چلی جائیں۔ہم جیسے بیشار لوگوں نے اس وقت اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ چلو اس عفریت سے تو جان چھوٹی اور اب کوئی ایسی حرکت کرنے کی شائد جرأت نہ کرے گا۔لیکن عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے۔ہم سب نے ماضی قریب میں ایسی پوری پارلیمنٹ دیکھ ڈالی ہے کہ جہاں لگ بھگ دو تہائی ارکان کولمبو یونیورسٹی جیسی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل تھے۔

گذشتہ سے پیوستہ اتوار ہم پر یوں بھاری گذری کہ ہمیں چھٹی والے روز تین مختلف اجتماعات میں اپنے شعبۂ مہارت پر لیکچرز کے لئے مدعو کیا گیا۔جو اہم بات ہم محسوس کر کے شاداں وفرحاں رہے وہ یہ تھی کہ پہلی مجلس میں تین سو سامعین میں سے لگ بھگ دو سو "ڈاکٹر" تھے۔ان تمام ڈاکٹروں میں واحد ہم سر پھرے ڈاکٹر تھے جنہوں نے فضول میں پانچ برس دیارِ غیر میں رہ کر دن رات پڑھنے اور تحقیق کرنے کی حماقت کی ہوئی تھی۔وگرنہ باقی کے ڈاکٹر صاحبان اپنے آپ کو پی ایچ ڈی یا ایم ڈی ظاہر کر رہے تھے۔جبکہ اُن میں سے محض 12 حضرات نے کولمبو سری لنکا میں پندرہ روز یونیورسٹی میں گزارے تھے جن میں سے زیادہ تر کولمبو کی سیر میں گزرے تھے اور پھر 800 تا 1500 ڈالر علاوہ خرچہ کولمبو یونیورسٹی کو ادا کر کے ایک مرصع ومزین رنگین کاغذ پر ایم ڈی یا پی ایچ ڈی چھپوا کر لے آئے تھے۔باقی کے ہومیو ڈاکٹر تھے جن کی ابھی تک نہ تو کونسل بنی ہے اور نہ ہی ان کی ڈگری ایچ ای سی نے قبول کی ہے۔ایچ ای سی نے تو باقی کے 12 "ڈاکٹروں" کی ڈگریاں بھی تسلیم نہیں کی ہوئی ہیں لیکن جرأت ہے کسی حکومتی عہدے دار کی جو ان کے کلینک میں قدم رکھ سکے۔ہمیں اپنے یورپ میں بسر کردہ پانچ برس پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا کیونکہ ہم اگر اس قدر احمق نہ ہوتے تو ان ہی وقتوں میں کمپیوٹر سے رنگین ڈگری پرنٹ کر کے آج پارلیمنٹ میں جا بیٹھے ہوتے۔اور دھڑلے سے جمشید دستی کی طرح اکڑ کر دوسروں کو آنکھیں دکھا رہے ہوتے کہ کر لے ایچ ای سی نے جو کرنا ہے ہم پارلیمنٹیرینز ہیں لہٰذا قانون سے بالاتر ہیں۔

پھر گذشتہ اتوار ہمیں اسلام آباد کے پلاننگ کمیشن میں گزارنے کا موقع ملا جہاں 150 سامعین میں سو سے زائد اصلی والے ڈاکٹر یعنی پی ایچ ڈی تھے۔اور ابھی وفاقی وزیر احسن اقبال کی صدارت میں حکومت وقت اور گوروں سے وعدے کر رہے تھے کہ اگر ہمیں مزید تحقیق کے لئے فنڈ جاری کر دیئے جائیں تو انشاءاللہ ہم فلاں فلاں سیکٹر میں مقدور بھر ترقی لے آئیں گے۔ہمیں سری لنکا والے ڈاکٹروں کو مل کر پریشانی ہو رہی تھی کہ کہیں ہمارے پیارے وطن میں شاید اب

یہی دونمبر ڈاکٹر رہ گئے ہیں ۔لیکن اسلام آباد دوسرے گروہ میں اصلی ڈاکٹروں کو دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ نہیں ایسا ہرگز نہیں ۔ یہ ضرور ہے کہ دونمبروں کی بہتات ہوگئی ہے لیکن ایک نمبر بھی ابھی پوری طرح مرے نہیں ہیں۔ گو کہ ایچ ای سی اور یونیورسٹیوں کے تحقیقی فنڈ زروک کر دونمبریوں نے ایک نمبری ڈاکٹروں کو دم گھوٹ کر مارنے کی پوری کوشش کر ڈالی ہے لیکن یہ ایک نمبر ڈاکٹر بھی خاصے ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں ۔مرتے مرتے بھی ابھی دو چار حکومتیں بھگت لیں گے ۔

ہم جان تو بہت کچھ گئے تھے لیکن پھر بھی دنیا کی چند مشہور ڈکشنریوں کو کھنگال کر ڈاکٹر کے معانی تلاش کئے ۔ وہاں صرف دو طرح کے ڈاکٹروں کا ذکر ملا۔ ایک خاص اتھارٹی والے ڈاکٹر یعنی پی ایچ ڈی اور دوسرے معالجین جن کو کافی مدتوں سے ڈاکٹر بھی کہا جا رہا ہے معالجین میں سے بھی صرف ایم ڈی، ایم بی بی ایس یا کسی حد تک ڈی وی ایم ڈاکٹر کی تعریف پر پورا اترتے ہیں لیکن بصد کوشش کے ہومیو پیتھ اور یونانی میڈیسن والوں کو ڈاکٹروں کی فہرست میں ڈھونڈ نہ پائے ۔اور نہ ہی ہمیں سری لنکا کے دو ہفتہ والے ڈاکٹر نظر آئے ۔دونمبر ڈاکٹروں کو معلوم ہے کہ نہ تو وہ خود ڈکشنری کھولتے ہیں اور نہ ہی ''متجسس'' عوام ۔بس وہ اس اصول پر اپنی اپنی کانفرنسیں تک کر ڈال رہے ہیں کہ'' لگے رہو منا بھائی ۔کوئی پوچھنے والا نہیں''۔

ابھی ہم اپنی ایک نمبر ڈاکٹری کے زعم میں خون کو جلا ہی رہے تھے کہ ہمارے ایک میٹرک پاس حبیب بنک کی 37 سالہ کلرکی کر کے ریٹائر ہونے کے بعد امریکہ سے ایک ماہ کا کوئی کورس کرنے والے ڈاکٹر ڈایابیٹی (ذیابیطس) کا فون آ گیا ۔ ہمارے اس استفسار پر کہ آپ تو ہمارے ساتھ ہی چودہ برس قبل امریکہ ایک ماہ کا این ایل پی کا ڈپلومہ کرنے گئے تھے تو آپ نے کب ایک سوڈالر ادا کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری پرنٹ کی ہے کہ اب آپ با قاعدہ ڈاکٹر لکھنے لگ گئے ہیں ۔اس پر ہمارے ان دیرینہ دوست نے کھڑاک سے فون بند کرنے سے قبل جو جو جملہ ادا کیا ہے وہ ہمیں عوامی آواز بن کر ستاتا رہتا ہے کہ ''اگر میں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری خرید لی ہے تو اس سے تمہاری پی ایچ ڈی تو پنکچر نہیں ہوگئی؟'' قارئین ہماری بلا سے کوئی ڈگری خرید کر ڈاکٹر بنا پھرے ۔چاہے اس نے ہومیو پیتھک کی ہی خرید کر اپنے آپ کو ڈاکٹر کہلانا کیوں نہ شروع کر دیا ہو۔ ہم تو بچپن کے اس کمپاؤڈر کو بھی بھول چکے ہیں جس نے بعد میں ڈاکٹر کا بورڈ لگا کر پریکٹس شروع کر دی تھی ۔ہمیں تو اپنی یورپین پی ایچ ڈی پر رہ رہ کر غصہ آتا رہتا ہے کہ اس پھرے ہوئے دماغ والی ڈگری کے لئے ہم نے فضول میں پانچ برس دن رات پڑھنے اور تحقیق کی حماقت کی ۔اس خون پسینے کی کمائی ہوئی ڈگری پر آج ہمیں پھر رونا آ گیا ہے کہ جب ہمارے ہی ایک پڑھے لکھے بزرگ نے بیچ مجلس یہ اعلان فرمایا کہ پاکستان کو صرف پڑھے لکھوں نے برباد کیا ہے ۔عین ممکن ہے ان کا اشارہ اپنے سے زیادہ پڑھے لکھوں کی طرف ہو لیکن ایک دلیل بہر حال ان کی لاجواب تھی کہ آج تک ساری حکومتیں، فوج، عدلیہ و بیوروکریٹس پڑھے لکھے ہی تو تھے جنہوں نے مل جل کر پاکستان کو اس حالوں تک پہنچایا ہے ۔ہم نے جواباً بہت زور شور سے ان شاہ سواروں کا ذکر کیا جو میدان جنگ میں گر پڑے تھے اور اس گھٹنوں کے بل رینگنے والے ایک ننھے میاں کا بھی تذکرہ کیا جو مزید گر نہ سکتا تھا مگر مجال ہے کسی کے کانوں پر جوں تک رینگی ہو۔ اور جوں نہ رینگنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان بزرگ کے سر میں جوئیں تھی ہی نہیں ۔کیونکہ جوؤں کی پناہ گاہ یعنی بال دور دور تک نہ تھے ۔

اور آج تو ہمیں آگ لگ گئی ہے اخبار میں یہ خبر پڑھ کے کہ پاکستان میں لگ بھگ ساڑھے سات ہزار پھرے ہوئے دماغ ہیں جبکہ بھارت میں غالباً ساڑھے سات لاکھ اور گمان غالب ہے کہ دنیا بھر میں ساڑھے سات کروڑ ۔ ہمارے بزرگ کے حساب سے تو بھارت ہم سے دس گناہ زیادہ تباہ حال ہونا چاہیے اور دنیا ہزار گناہ۔ لیکن جاوید چوہدری کے ایک کالم میں ہم نے جب یہ پڑھا کہ ایک فوجی نے ساٹھ کی دہائی میں جب پاکستان کو انتہائیں چھونے کے قابل بنایا تو پھر مغرب نے ایک پڑھے لکھے سیاستدان کو مسلم طاقت کے غبارے سے ہوا نکالنے کے لئے بھیج دیا۔ ہر چیز گئی حتیٰ کہ تعلیم بھی گئی ۔ اور جس کا نتیجہ ہے کہ ہر پڑھے لکھے نے اپنی استطاعت کے مطابق اس ملک کو خوب خوب لوٹا۔ آیئے آج ہم پڑھے لکھوں باشعور ڈاکٹروں کی وفات پر کلمۂ خیر ادا کرنے نیز دو نمبر ڈاکٹروں کی دن دُگنی رات چوگنی ترقی کے لئے ہاتھ اٹھائیں۔ خصوصی طور پر اس ان جی او کے لیے ضرور دعا کریں جو آج کل ایک سیاستدان کی زیرِ صدارت ان پڑھوں کو سری لنکا سے ڈگریاں دلوانے کے وعدے باقاعدہ طور پر الحمرا کے سٹیج سے کر رہی ہے۔ نیز ملک عزیز کو اہلِ دانش سے پرے رہنے کی توفیق کی بھی درخواست کریں ۔ ورنہ کہیں غلطی سے ہم امریکہ کی طرح ترقی نہ کر جائیں ۔ ایسا تو ہمارے دُشمنوں نے بھی کبھی تصور نہ کیا ہوگا۔

؎ ہر شاخ پہ اُلو بیٹھا ہو

انجامِ گلستاں کیا ہوگا

دانشوران بوٹا فرائیڈ چکن

پیارے دوستو! پچھلے مہینے سے ہم نے بھی پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر اپنے آپ کو دانشور سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ فلاسفرِ اسلام نے من اور تن کی دنیاؤں میں فرق کو جو یوں بیان فرمایا تھا کہ من کی دنیا فقر و فاقہ نیز عشق و مستی پر مشتمل ہے جبکہ تن کی دنیا محض سود و سودا اور مکر و فن سے عبارت ہے۔ اس پر ہم نے سود و سودا کی رنگین فضاؤں میں تیرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مگر ساتھ ہی تھوڑی سی عشق و مستی بھی مختص کر لی ہے تاکہ دانشوری ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ جونہی ہم من کی دنیا کو خیر باد کہہ کر تن و توش کی بڑھوتری میں جُت گئے ہیں تو اس فلسفے پر سوچنا ہی بند کر دیا ہے کہ تن اور من دونوں میں نسبتِ معکوس ہے۔ یعنی جب تن بڑا ہو گا تو من چھوٹا ہوتا چلا جائے گا۔ ہمارے سامنے بیٹھے ایک دانشور نے وقت گزاری کے لیے یہ سوال داغا کہ کیا کبھی کسی نے مفکر کو موٹا یا موٹے کو فکر کرتے دیکھا ہے؟ ہم نے فوراً کہا کہ ہاں ہم نے ایسا ہوتے دیکھا ہے۔ وجہ یہ بیان کی کہ جب سے کتابیں عالیشان دوکانوں سے پھسل کر فٹ پاتھ پر پہنچی ہیں" اور فٹ پاتھی فوڈز" شاندار دوکانوں میں فاسٹ فوڈز کے طور پر براجمان ہوئی ہیں تب سے موجودہ وقتوں کا قاری، لکھاری اور کھلاڑی فوڈ سٹریٹ پر ناک لگا کے بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔ اور تبھی سے مفکرین موٹے ہوتے ہوتے اب "تھنک ٹینک" کہلانے لگ گئے ہیں۔ اس دور کے دانشور ایک قلمی پھل کی طرح کی کوئی قلمی نسل ہے جو تن کی بھی بڑی ہے اور من کی بھی۔ یہی کچھ دیکھ کر انکل بدروح نے بھی فیس بک پر کچھ دانشوری گھولی ہے۔ کہتے ہیں کہ جو قوم مہنگے جوتے خرید کر پھولی نہ سمائے اور سستی سی کتاب بھی نہ خریدنا چاہے تو اس کا تو یہ مطلب نکلتا ہے کہ اس کو کتابوں کی بجائے جوتوں کی زیادہ ضرورت ہے۔

اب جب کہ ہر روایت الٹی اور ہر بات مادی ہو گئی ہے تو شاید غذائی کیبرے کا فوڈ سٹریٹس کو دیکھ کر رونا عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آ سکے۔ کیونکہ جو مزے پیزے سے ملتے ہیں اور جو شوارمے اور کورمے لے کر موڈ خوشگوار ہوتا ہے وہ اردو بازار کا نام لیتے ہی ابکائیوں پر اتر آتا ہے۔ کہ بھلا یہ کون سا بازار ہے کہ جہاں کتابیں ہی کتابیں ہیں۔ آج کا دانشور گاڑی کا اے سی، ایکسیلیٹر اور مغربی موسیقی ذرا تیز کر کے گنگناتا ہوا سوچ رہا ہوتا ہے کہ فکر کے ساتھ فاقے کرنے سے بہتر ہے کہ پیجے کے پائے، سردار کی مچھلی اور پاک ٹی ہاؤس کے سینڈوچ کھا کر دانشور کہلائیں۔ کیونکہ اصل بات دانشمندی نہیں بلکہ دانشوری ہے یعنی دانش سے دانشور زیادہ اہم ہے۔ جب سے ہم نے ذہن سے سوچنے کی بجائے معدے سے سوچنا شروع کیا ہے تب سے ہماری دانشوری بوٹا فرائیڈ شاپ میں بیٹھ کر دو آتشہ ہو چلی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تب سے ہی دولے شاہ کی چوہیوں کی طرح دانشوروں کے سر بھی چھوٹے اور پیٹ بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ یعنی پھر وہی بات کہ من کی دنیا چھوٹی سے چھوٹی اور تن کی دنیا موٹی سے موٹی۔

معدے کی حکومت لاہوریوں کے بھی سر چڑھ کر بول رہی ہے۔ ان کے چٹخارے میں اضافے کے لئے جہاں

عالمی فوڈ چینز مثلاً کے ایف سی، میکڈونلڈ، سب وے وغیرہ آن پر احسان ہوئے ہیں۔ وہیں دیسی ساہوکاروں نے بھی ان کے ناموں کی نقل کرکے دیسی فوڈز کو لائق بیچ دینا شروع کر دیا ہے۔ اب محمد بوٹے نے کے ایف سی سے بی ایف سی یعنی بوٹا فرائیڈ چکن بنا ڈالی ہے۔ داؤد صاحب نے میکڈونلڈ سے ''مسٹر داؤد'' بنا کر سری پائے کو یورپی ٹچ کا لگا دیا ہے۔ اور سب وے کو ''ماہی وے'' سے بدلنے والوں نے گلی سڑی مچھلیوں میں مصالحے بدل بدل کر مہنگے داموں ہمارے معدوں کو شکار کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور تو اور ''بون فائر'' کے نام سے ریسٹورنٹ کھل گئے ہیں جو انتہائی کاریگری سے امیروں کی ناجائز کمائی کو ان سے بھی زیادہ ناجائز طریقے سے اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کر رہے ہیں۔

ہمیں بھی شاید لوگوں کو گدگدانے میں مزا آتا ہے اس لئے جونہی محفل میں ہم نے کہا کہ جتنا معدہ بڑا ہوتا ہے اتنا ہی دماغ چھوٹا ہوتا ہے تو فوراً دانشوروں کی محفل میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔ چونکہ بحث میں مصروف سبھی کے معدے گھٹنوں گھٹنوں پھیلے ہوئے تھے تو پھر بھلا کون تسلیم کرتا کہ اس کا دماغ چھوٹا ہو گیا ہے؟ یہ چھوٹے بڑے کی بات شاید وزن کے لحاظ سے اتنی درست نہ ہو کہ جتنی وژن کے لحاظ سے درست ہے۔ لیکن اگر بلا تکان کھا بے کھانے والے وزن اور وژن کو بھی آپس میں خلط ملط کر دیں تو ہم کسی کا کیا بگاڑ لیں گے۔ اس محفل میں ایک سائنسدان نما مولوی صاحب نے قریب قریب فتویٰ ہی صادر کر ڈالا کہ سب انسانوں کے دماغ کا سائز رب تعالیٰ نے ایک جیسا بنایا ہے۔ نیز انہوں نے قرآن کریم کے حوالے سے ہم سب کو واضح حکم دے ڈالا کہ جی بھر کے کھانا کھاؤ بھلا تم خدا کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟۔ لوہور چوپو۔ اس بحث سے تنگ آ کر ہم نے دور حاضر کے سائنسدانوں کی اماں یعنی گوگل سرچ انجن کو بغیر ایندھن کے چلایا تو احمق چل پڑی۔ کہتی ہے کہ زیادہ کھانے سے دماغ کی کارکردگی شدید طور سے متاثر ہوتی ہے۔ اب متاثر کے بھی دو مطلب ہیں صحت کی طرف متاثر ہونا اور بیماری کی طرف۔ گوگل کہتا ہے بیماری کی طرف مگر پیٹ کے پجاری کہتے ہیں اچھائی کی طرف۔ ہائے اور با کتھے جاواں۔

چلیں فوڈسٹریئی دانشوروں کے مسئلے کے حل کے لئے اپنے معاشرے کے بزرگ اور عقلمند لوگوں سے اس کا ذکر کر کے دیکھتے ہیں کہ ان کی کیا رائے ہے؟۔ لیجئے یہ ہیں ستر سالہ سنیاسی بابا جو پچھلے سو سالوں سے (راتیں ڈال کر) برما کے غاروں سے عقل کے موتی ڈھونڈ رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جو برائلر اپنے پاؤں پر نہیں چل سکتا وہ ہمارے دماغ کو کیا تقویت دے گا؟ لگتا ہے یہ برائلر کو کشتی کے لئے استعمال کرنا چاہ رہے ہیں۔ چلئے انہیں چھوڑیئے ان سے ملئے یہ ہیں سیاسی شطرنج کے شاطر اعلیٰ عرصہ پانچ سال سے بیوی مروا کر حاکم بن کر بیٹھے رہے۔ فرماتے ہیں کہ زیادہ کھانے سے عقل تیز ہوتی ہے۔ وہ مارا، انہوں نے شاید دولت کو کھانا سمجھ رکھا ہے۔ انہیں بھی چھوڑیئے۔ ذرا ان حضرت مولانا عفی اللہ عنہ سے پوچھتے ہیں کہ یا حضرت زیادہ کھانے والے کی عقل کند ہو جاتی کیا؟ فرماتے ہیں لاحول والاقوۃ۔ اگر سعودی عرب میرے مدرسہ کو رقم فراہم کرتا رہے تو کس کافر کو ضرورت ہے کہ عقل استعمال کرتا پھرے۔ لو کر لو گل۔ چلئے ان خاتون سے پوچھتے ہیں۔ جو اپنے بچے کی طرف اشارہ کر کے کہتی رہتی ہے کہ یہ مو اتو ہر وقت میرا دماغ کھاتا رہتا ہے۔ پھر بھی چشم بدور میرا دماغ ہشاش بشاش ہے۔ چونکہ پڑھی لکھی نہیں ہے اس لئے بچاری کو دماغ ہی سے سوچنا پڑتا ہے۔ تبھی تو اس نے دانشوروں جیسی باتیں کرنا شروع کر دیں ہیں۔

چھوڑیے سب کو جلدی سے ہمارا جواب سن لیں کیونکہ ہمیں دیر ہو رہی ہے ایک ڈنر سے۔ جہاں کوشش کرنی ہے کہ اس کھانے کو ہر کھانے کی طرح زندگی کا آخری کھانا سمجھ کر کھائیں تاکہ ہر کوئی یہی کہے کہ موصوف کھاتے پیتے مرے ہیں۔ کیونکہ بھوکے مرنے سے کھاتے پیتے مرنا بہتر ہے۔ ہمارا جواب ہے کہ ایک بھینس منوں چارہ کھا کر بھی بین سن کر سر نہیں دھن سکتی۔ تو ثابت ہوا کہ جتنا پیٹ بڑا اتنا ہی دماغ چھوٹا۔ اگر حیوانی مثال قبول نہ ہو تو دولے شاہ کی چوہی دیکھ لیں۔ منہ چوہی اور ٹیڈ کھوئی (یعنی پیٹ کنواں)۔ اور اگر مولانا فضل الرحمان ناراض نہ ہو جائیں تو مثال پیش کرتے ہیں جناب نواز شریف کی۔ دیکھئے ہمارے گول گپے وزیر اعظم گوالمنڈی کا کھانا بھی کھاتے رہتے ہیں لیکن عقل پھر بھی ترقی کرتی جا رہی ہے۔ پہلے ق لیگ کو گنوا دیا اور اب میثاقِ جمہوریت کے عشق میں پیپلز پارٹی کو گود لے لیا ہے اور باقی سب پارٹیوں سے پھڈا ڈال لیا ہے۔ پنجاب بھائی کے حوالے کر دیا ہے جنہوں نے آگے اس کو بیٹوں کے حوالے کر کے خود دن رات مرکز میں آنے کی تربیت حاصل کرنا شروع کر دی ہے۔ ابھی ابھی ہمیں معدے اور عقل یعنی فوڈ سٹریٹ اور دانشوروں کے حوالے سے ایک اور منطق سوجھی ہے۔ اور وہ یہ کہ افطاری کرتے ہی وبڑ دبڑ کھانے کے بعد جو کمزوری اور تھکن محسوس ہوتی ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ معدہ وزنی ہونے کے باعث اس خون کا رخ بھی اپنی طرف کر لیتا ہے جو دماغ کی جانب جانے والا ہوتا ہے۔ اور یوں شروع ہو جاتی ہے معدے اور دماغ کے بیچ لڑائی۔ یہ ایک ایسا ٹی ٹوئنٹی جس پر جتنا چاہے جوا لگا لیں مگر آپ پکڑ نہ سکیں گے بکیوں کو۔ اللہ حافظ۔

ڈائٹ کھجور اور ڈائٹ پکوڑے

ہم چونکہ اس دھرتی کے ڈھیٹ سپوت ہیں اس لیے آج ذرا تسکین طبع کی خاطر کالم بگھارنا چاہ رہے ہیں لہٰذا اپنے پیارے قارئین کو پیش لفظ کے طور پر بتاتے چلیں کہ ڈائٹ اینڈ نیوٹریشن ہمارا مضمون خصوصی ہے، ماحولیات مضمون عمومی نیز کالم نگاری مضمون مجبوری ہے ان سب کی کھچڑی کو غذائی تحفظ کہتے ہیں۔اس لحاظ سے ہمیں ڈائٹ یا ڈائٹنگ کے معنی خوب معلوم ہیں۔اپنے مضمون خصوصی میں ہماری پریکٹس کو ناقدین یوں بھی بیان کرتے ہیں کہ خود غذا کھاتے چلے جانا اور دوسروں کی بند کراتے رہنا۔اس تضاد کی وجہ وہی ہے جو کہ خبر کے معنی میں پوشیدہ ہے۔یعنی اگر ہم کہیں کہ کتے نے آدمی کو کاٹ لیا تو شاید اسے خبر کا درجہ حاصل نہ ہو پائے اس لئے معاشرے کو چونکانے کی خاطر اور اپنی بڑ کو خبر کا درجہ دلانے کے لئے ہم یہ کہیں گے کہ آدمی نے کتے کو کاٹ لیا اور اگر ایسا ہو جائے تو بآسانی اس خبر کو بریکنگ نیوز کے طور پر بھی نشر کیا جا سکتا ہے اور کاروبار چمکایا جا سکتا ہے۔

برسوں سے ڈاکٹر و حکیم یہ کہتے چلے آ رہے ہیں (دوسروں کو) کہ مٹھائی کم کھاؤ تو کوئی بھی نوٹس لینے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔لیکن جب سے ڈائٹ مٹھائی ایجاد ہوئی ہے تب سے تو شوگر کے مریضوں نے بھی نوٹس لینا شروع کر دیا ہے۔اس لیے مجبوراً اپنی بات میں خبر بھرنے کے لئے ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ ڈائٹ کھجور کھالو۔ارے بیگم ذرا ڈائٹ پکوڑے تلنا۔خوشامدی کو سامنے دیکھتے ہی فرمائش کرنے لگتے ہیں کہ حضور آج ذرا ڈائٹ گفتگو فرمایئے گا کیونکہ ابھی کل ہی ہمیں بیگم سے اپنی اوقات کا پتہ چلا ہے لہٰذا ابھی ہم نہیں چاہتے کہ اپنی معصوم بیگم کو جھوٹا سمجھنا شروع کر دیں۔کبھی ہم صبر کا پھل میٹھا کہتے تھے تو لوگ واقعی صبر کرنے لگ جاتے تھے۔لیکن اب ڈائٹ پھل ہو جانے کے باعث لوگوں کی بجائے محض ہم ہی صبر کرنے پر اکتفا کرتے رہتے ہیں۔الیکشن جیتنے کی خوشی میں ڈائٹ مٹھائی بانٹتے ہوئے سیاستدان کو کہنا پڑتا ہے کہ بھئی یہ اریبین ڈیلائٹس کی خالصتاً ڈائٹ مٹھائی ہے۔منگنی و نکاح پر ڈائٹ مبارکباد دیتے ہوئے اب ہمارا چہرہ بھی ویسے ہی میکانکی انداز میں شکریہ ادا کرتا ہے جیسے کالا بیورو کریٹ کیڑے مکوڑوں یعنی عوام کو دیکھ کر گردن ہلاتا ہے۔

موجودہ رمضان المبارک کے آنے تک ڈائٹ سیون اپ اور ڈائٹ پیپسی کا اتنا رواج ہو گیا ہے کہ شوگر اور دل کے مریضوں نے اس کو اپنی بیماری کا علاج سمجھنا شروع کر دیا ہے۔یہ ایک کامیاب اشتہاری مہم اور مارکیٹنگ کا کمال ہے کہ اپنی پروڈکٹ کو بیچنے کے لیے ایسا نعرہ لگایا جائے کہ آدھا سچ ہی سامنے آپائے۔اسی کامیاب آئی ٹی نے کبھی امی کو ماما اور ابو کو پاپا بنایا تھا۔جبکہ ماما باورچی خانہ سنبھالنے والی ملازمہ اور پاپا عیسائیوں کے مولوی کو کہا جاتا تھا اور کہا جاتا ہے۔آہستہ آہستہ ہماری تن آسانی نے ذہن کو مہمان اداکار بنا کر رکھ دیا ہے۔اور ہم نے دو چار اونس کے مغز کو حصول علمی کی طویل تکالیف سے بچانے کے لیے فیس بک کے حوالے کر دیا ہے اور پکا پکایا علم مغرب سے تڑانا شروع کر دیا

ہے۔تبھی تو کتے کا نام ٹیپو اور حرام خودکشی کو حلال خودکش حملے کا نام دے دیا ہے۔یقین کریں ان بالغ نظریات کے پیش نظر اب بچوں کے منہ سے بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ کے نام سنتے ہوئے سر بھی پیٹنے کو دل نہیں کرتا کہ خوامخواہ صبح لگائی گئی شیمپو اور جیل کا کباڑہ نہ ہو جائے۔جب ہم بچپن میں اپریل فول منایا کرتے تھے تب اساتذہ ٹیوشن اور نوٹس کی دوکانداری نہیں کیا کرتے تھے اور ہمیں سمجھایا جاتا تھا کہ بچو یہ مسلمان دشمن تہوار ہے اور اسے منانا گناہ ہے اب ہم نے بچے کو خود انٹرنیٹ پر بٹھایا ہے تو بھلا کس منہ سے اسے ہم ویلنٹائن ڈے جیسے تہوار منانے سے منع کریں گے؟

جب ہم یورپ امریکہ وغیرہ جانا شروع ہوئے تو پہلے پہل ہم نے وہاں کی لوکل زبانوں کی گالیاں سیکھیں اور مزے لے لے کر ہر فریش آن بورڈ کو تنگ کرتے رہتے تھے۔درحقیقت یہ غیر ملکی زبان سیکھنے کا ڈائٹ طریقہ ہے۔بس ڈائٹ غذاؤں کا غذائی سائنس میں وہی مقام ہے جو کسی بھی زبان میں گالیوں کا ہے۔ہمیں ابرارالحق کی ڈائٹ کھجور اور ڈائٹ پکوڑوں والی اصطلاح بہت اچھی لگی ہے۔جو کہ ہماری قومی سوچ کی بھی بہترین تشریح ہے اور ہم اپنی قومی افتادطبعی کے دباؤ کے باعث اب ڈائٹ مشروبات کو بھی غیر مضر سمجھنے لگ گئے ہیں۔اسی افتادطبعی کی کئی ایک مثالیں ہماری روزمرہ کی زندگی میں بکھری پڑی ہیں یعنی شاید یہ انسانی فطرت ہے کہ آگ کو گھور کے دیکھتا ہے۔حادثے کی جگہ مزہ لینے کھڑا ہو جاتا ہے اشارہ توڑ کے اپنے آپ کو اکشے کمار سمجھتا ہے۔حکومت کی مخالفت کرنے والی اپوزیشن سے محبت کرنا شروع کر دیتا ہے۔اور جونہی وہی اپوزیشن حکومت میں آتی ہے تو پھر اس کی اپوزیشن ڈھونڈنا شروع کر دیتا ہے۔بس یا جہاز کو ابھی پوری بریک نہیں لگتی کہ کھڑا ک سے سیٹوں کے درمیان کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنے مال غنیمت سمیت کافی دیر دوسروں کو معطر بغلیں سنگھاتا رہتا ہے۔سڑک پر یوں گاڑی بھگائے گا جیسے جاپانیوں کی طرح اپنے کام سے اس قدر عشق ہے کہ ایک لمحہ ضائع کرنا پسند نہیں مگر گھر پہنچتے ہی انڈیا کی فلم دیکھنے بیٹھ جائے گا۔

اسی طرح جب سے نائن الیون والے دن لانگ آئی لینڈ نیو یارک میں ہم نے سی این این سے ورلڈ ٹریڈ سنٹر والی بریکنگ نیوز سنی تھی تب سے ہمیں اپنے میڈیا کی ہر بریکنگ نیوز ڈائٹ نیوز لگتی ہے کیونکہ چونکنے کی بجائے ہماری ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔خبریں سنانے والے بھی بے چارے خبر میں گہرائی نہ ہونے کے سبب انتہائی غیر اہم ٹکڑوں کو خبر میں یوں دہراتے چلے جاتے ہیں جیسے بیگم آئے دن اپنے جہیز کی آئٹمز دہراتی رہتی ہیں۔یا پھر جیسے مولوی صاحب بیچارے چندہ مانگ مانگ کر اپنا حجرہ سجاتے رہتے ہیں۔

لفظ ڈائٹ کے کئی فوائد بھی ہیں۔مثلاً پی ٹی وی کی ڈائٹ خبریں سن سن کر دیگر چینلز نے عوام کی سماعتوں و نگاہوں کو رنگین کرنے کے لئے رنگ بازی کی انتہا کر دی تھی۔جونہی یہ رنگ بازی ڈائٹ ثابت ہوئی تو پھر ڈائٹ کیبل اپریٹرز نے اسے چھٹی کا دودھ یاد کرا دیا ہے اور اب تو ڈائٹ بریکنگ نیوز کا یہ عالم ہے کہ پرگروموں کے بیچوں بیچ کشمیر سنگھ کی گت پکڑے محترم انصار برنی یوں برآمد ہوتے ہیں کہ جیسے یہیں سے سیدھے نوبل پرائز لینے نارو ے چلیں جائیں گے اور ٹی وی کہتا ہے کہ یہ بریکنگ نیوز تھی۔مزید برآں پہلے ہم مائیکل جیکسن کے سبب بریک ڈانس سے متعارف ہوئے تھے۔اور اب ڈائٹ ڈانس کے ذریعے عامر لیاقت دریافت ہوا ہے۔اجازت لینے سے قبل ہم ڈائٹ اساتذہ، ڈائٹ ڈاکٹرز اور ڈائٹ تاجروں کو نہیں چھیڑیں گے کیونکہ وہ اگر اپنی ڈائٹ حرکات سے باز آ گئے تو کہیں ہمارا ملک ترقی کی راہ پر

گامزن ہی نہ ہو جائے۔اور ترقی والا یہ ہمارا ڈائٹ خواب ایسا ہے کہ خواب ہی رہے تو بہتر ہے وگرنہ ترقی کر جانے کی صورت میں ہمیں کام کرنا پڑ گیا تو پھر ہم کہاں جائیں گے کیونکہ کام تو جوان کی موت ہے۔

عید برائے فروخت

ہم چند عیسائی ممالک میں خاصہ عرصہ اپنے اس ایمان کی حفاظت فرماتے رہے کہ جس کو ہم اپنے دیس میں اکثر عید و شب برات پر اپنے کاروباری بھائیوں کے ہاتھوں لٹتے دیکھتے رہتے ہیں۔ آج ہم آپکو دو ہڈ بیتے واقعات سنانا چاہ رہے ہیں جس سے عیسائی و مسلم سوسائٹی کے سماجی ڈھانچے کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ پہلے ذرا ان ''کافر'' ممالک کا ذکر ہو جائے۔ ہم اپنی فیملی کے ہمراہ وارسا شہر کے ایک بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور ''میگا سام'' میں گھوم رہے تھے۔ دسمبر کی یخ سردی اور کرسمس سر پر تھی ہمیں یونیورسٹی سے چھٹیاں ہو چکی تھیں اور ہم اس خوف سے میگا سام کی طرف بھاگے کہ ان کے ہاں عید کی چھٹیوں سے قبل گھر کے لئے کچھ خریداری کر لیں۔ سٹور میں داخل ہوتے ہی ہمارے سات سالہ بیٹے نے ہمیں ایک جانب تقریباً گھسیٹتے ہوئے ایک انتہائی خوبصورت روئی جیسے بھالو کے حصول کے لئے ضد شروع کر دی۔ ایک عام پاکستانی کی طرح ہم نے اس کے گلے میں لٹکی قیمت والی پرچی کی جانب دیکھا اور پھر بچے کو بہلانے پھسلانے کے لئے ادھر اُدھر کی ناک ٹوتیاں مارنے لگ گئے۔ اور اُسے مزید ''چیزیں'' دکھانے کے لئے دوسری منزل کی طرف بڑھ گئے۔ سٹور میں اکا دُکا لوگ تھے اور اس کے سنسان کاریڈور اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ شاید کل سے یہ سٹور بھی ''عید'' کی وجہ سے بند ہو جائے گا۔ اچانک ہمیں نچلی منزل سے آتے ہوئے ایک ''میکوائی'' پر ہماری نظر پڑی جو چند بچوں کے جلو میں وہی بھالو اٹھائے ہماری طرف بڑھا اور ہمارے بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھرتے ہوئے بھالو اس کے حوالے کرتا ہوا اگلے سیکشن کے طرف بڑھ گیا جہاں اس کے ہاتھ میں کچھ مزید تحائف کچھ اور بچوں کے لئے بھی تھے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ہم میکوائی کی تعریف کر دیں۔ یہ کرسمس کے نزدیک ایک فرضی کردار نبھانے والا کوئی بزرگ ہوتا ہے جو سرخ فر کا کوٹ پہنے سر پر سفید اونی ٹوپ لئے بچوں کے لئے ''خداوند ابن مریم'' کی جانب سے تحفے بانٹتا اور دعائیں دیتا ہوا ایک کردار ہے جسے انگریزی زبان میں سانتا کلاز کہتے ہیں۔ یہ کرسمس کے لگ بھگ نمودار ہوتا ہے اور بچوں کی خوشی کا باعث بنتا ہے۔ ہم نے رخصت ہوتے وقت سٹور کی مینجر کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔ اور پھر چپکے سے اس سے پوچھ لیا کہ میکووائی کرسمس سے ایک ہفتہ پہلے کیسے اچانک نمودار ہو گیا۔ عزیز قارئین اس عیسائی عورت کا مومنانہ جواب سُنیئے۔ اس نے سینے پر کراس بناتے ہوئے اور میرے بچوں کے سر پر پیار کرتے ہوئے مجھے آہستگی سے بتایا کہ یسوع مسیح بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں انہوں نے اس بچے کی ضد دیکھ لی تھی۔ بس ہم نے جلدی سے اپنے سٹاف کے ایک ممبر کو سانتا کلاز کا لباس پہنایا اور وہ عید آج ہی کر ڈالی جو اگلے ہفتے آنے والی ہے۔

اور آج چوبیس برس بعد ویسی ہی ایک مسلمانوں والی عید الفطر ہمیں اپنے پیارے اسلامی ملک پاکستان میں آئی ہے جہاں ایک بار پھر ایسا ہی حسنِ اتفاق ہوا ہے۔ اب کے بار ہماری نو برس کی سب سے چھوٹی بیٹی ہمارے ساتھ لنک

روڈ پر گھوم رہی تھی کہ اسے بھی ایک روئی جیسا سفید بھالو پسند آ گیا اور اس نے پلازے کے باہر شوکیس میں مسکراتے اس بھالو کے سامنے سے ہٹنے سے انکار کر دیا۔ حسبِ معمول ہماری نظر اس کے پرائس ٹیگ پر گئی اور سر ہلکا سا چکرایا، ہم نے سوچا آج تیئسویں روزے کے باعث شاید نقاہت ہو گئی ہے جسے نظر انداز کرتے ہوئے بچوں کو دوکان کے اندر جانے کا کہہ کر قریبی اے ٹی ایم کی طرف لپکے۔ ہمارے ذہن میں یہ تھا کہ یہاں کوئی ''پاپا سمرفا''، ''میکووائی'' یا سانتا کلاز آنے والا نہیں ہے اور نہ ہی یہاں یسوع مسیح کی نظر پڑنے والی ہے۔ اس لئے جس طرح رُبع صدی پیشتر ہمارے پہلے بیٹے کا دل بھالو کو پا کر نہال ہوا تھا آج ہم اپنی جیب سے اسے خرید کر اپنی آخری بیٹی کا دل باغ باغ کر دیں گے۔ ہم سیلز بوائے سے اس بھالو کو یہاں کاونٹر پر لانے کا کہہ کر اپنی بیٹی کے چہرے پر ابھرتی قوسِ قزح کو دیکھنے میں مصروف ہو گئے کہ اچانک کاؤنٹر کلرک کی آواز آئی سر سترہ ہزار نو سو روپے پلیز۔ ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ ابھی ہم نے خود اس کے پرائس ٹیگ پر گیارہ ہزار نو سو لکھا دیکھا ہے۔ اسی لمحے کاؤنٹر کے عقب سے ایک انتہائی نفیس چمکدار رنگت اور بھالو جیسی سفید داڑھی میں مسکراتے ہوئے حاجی صاحب نمودار ہوئے اور انتہائی عاجزی سے عرض کرنے لگے کہ سر ہم سے ''ٹائپنگ مس ٹیک'' ہو گئی تھی معذرت چاہتے ہیں۔ اور اپنی اس غلطی پر اوپر کے نو سو روپے چھوڑتے ہیں۔ ایک طرف ہماری معصوم بٹیا کی امنگوں بھری آنکھوں میں دھنک کے سات رنگ لہرا رہے تھے۔ دوسری جانب ہماری مجبوری کو بھانپ کر چھ ہزار روپیہ بڑھا دینے والی ٹائپ کی غلطی گھوم رہی تھی۔ ہمارے ہاتھ رقم گن کر لرزش سے ادائیگی کر رہے تھے زبان خاموش تھی۔ مگر ذہن میں فلسطین، عراق و شام میں اپنے ہم مذہب معصوم لوگوں کی چیخیں اور سسکیاں ہتھوڑے برسا رہی تھیں کہ کاش ہمارے ہاں بھی عید و دیگر تہوار پر کوئی سانتا کلاز بچوں اور ان کے والدین میں خوشیاں بانٹ رہا ہوتا یا کم از کم کوئی سفید چمکدار رنگت والا مولوی بزنس مین روئی جیسی سفید خوبصورت داڑھی سجاتے اتنا تو کر لیتا کہ گاہک کی نیت بھانپ کر قیمت نہ بڑھاتا۔ اور بچوں کی عید کی خوشیوں میں والدین کے حزن و ملال کی ملاوٹ نہ کرتا۔ تو شاید ہم روئے زمین پر اس طرح خجل و خوار نہ ہو رہے ہوتے۔ اللہ ہی جانے کون بشر ہے۔

آئی ڈی پیز کی بحالی بذریعہ کرکٹ

پنجاب کے وزیر کھیل رانا مشہود صاحب نے آئی ڈی پیز کو مشکل وقت کو ٹالنے کے لئے کرکٹ کھیلنے کا مشورہ دے دیا ہے۔ آئی ڈی پیز (ان وولینٹری ڈسپلیسڈ پرسنز یعنی غیر رضا کارانہ بے خانماں لوگ) یہ مشورہ سن کر ہکا بکا رہ گئے ہوں گے اور ساتھ ہی اللہ کے حضور شکر بجالائے ہوں گے کہیں انہوں نے جذبہ خیر سگالی کی عظیم مثال کے طور پر ان کو بے گھری کو صحیح معنوں میں انجوائے کرنے کے لئے پتنگ بازی کے ساتھ پکوڑے کھا کر بھنگڑا ڈالنے کا مشورہ نہیں دے ڈالا۔ وگرنہ آئی ڈی پیز کو اپنے موجودہ آرام دہ کیمپ چھوڑ کر اور انواع واقسام کے من وسلویٰ ترک کر کے اس ٹھنڈے ٹھار موسم میں شدید نیٹ پریکٹس کرنا پڑتی۔

ایک بار کسی گورکن نے اپنے علاج و معالجہ سے خوش ہو کر ڈاکٹر صاحب کا شکریہ بجالاتے ہوئے انتہائی خلوص سے یہ آفر کی کہ میں بوقت ضرورت آپ کے لئے مفت قبر کھود دوں گا۔ ڈاکٹر کے بگڑے تیور دیکھ کر ہاتھ باندھ کر وضاحت کرنے لگا کہ حضور میرا پورٹ فولیو ہی قبریں کھودنا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ خلوص و محبت کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ جو کسی کا پیشہ یا پورٹ فولیو ہو اسی طرح کی خدمات محبوب کو پیش کردے۔ اور اگر انتہائی پیشہ ور ہو تو اپنی جان پیش کردے چاہے اس کے لیے اس کو ہلکا سا بم دھماکا ہی کرنا پڑے۔ آج کل چونکہ آئی ڈی پیز کو خوش کرنے کی مہم جاری ہے تو جہاں ملک ریاض صاحب نے بے گھر افراد کے لئے مفت گھر تعمیر کرنے کا کام شروع کردیا ہے، درویش ڈاکٹر امجد ثاقب صاحب کی "اخوت" نے ان کا بحالی پروگرام شروع کردیا ہے۔ آرمی نے ٹرکوں کے ٹرک غذا اور کپڑا لتا فراہم کرنا شروع کردیا ہے۔ وہیں پر پنجاب کے غیرت مند سپوتوں پر مشتمل صوبائی کابینہ کے اراکین نے بھی اپنے اپنے پورٹ فولیو کے مطابق مقدور بھر خدمات پیش کردی ہیں۔ رانا مشہود صاحب کے کرکٹ کھیلنے کے مشورے کے بعد باری جناب سعد رفیق صاحب کی ہے اور ہم سوچ رہے ہیں کہ وہ اپنے پورٹ فولیو کے مطابق آئی ڈی پیز کے لئے خوشحال خاں خٹک ٹرین میں مفت سفر کی آفر دینے والے ہوں گے۔ بس ہماری آئی ڈی پیز سے درخواست ہے کہ جونہی وہ صوبہ کے پی کے کے سنگلاخ پہاڑوں میں اپنی آرام دہ بے گھر زندگی سے تنگ آکر کوئی ایڈونچر کرنا چاہیں تو وقت گزاری کے لئے پیدل ریلوے لائن تک آجائیں اور چوبیس چوبیس گھنٹے لیٹ ہو کر بلا مقصد دراز شہروں کا چکر کاٹ کر واپس پیدل اپنے ان ویران ایوانوں میں چلے جائیں جو ہماری حکومت نے ان کے لئے سنہری خوابوں سے تعمیر کئے ہیں۔

اسی طرز پر وزیر جیل ان کے لئے جیلوں کا جال بچھا کر مفت میں قید رہنے کی آفر کر سکتے ہیں۔ وزیر خزانہ ان کے بچے کھچے پیسے سے نیشنل انویسٹمنٹ بانڈ خریدنے کی درخواست کر سکتے ہیں۔ وزیر مذہبی امور ان کو فرض پانچ نمازوں کے علاوہ ہمہ وقت نماز شکرانہ ادا کرتے رہنے کی تلقین فرما سکتے ہیں کیونکہ قدرت نے انہیں دہشتگردی کی برکت سے نئے

نئے علاقے انجوائے کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ وزیراطلاعات ان کو اس شرط پر کھلے آسمانوں تلے ٹی وی نشریات دکھانے کی آفر لگا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ٹی وی خود خریدیں اور کسی خاص چینل کی نشریات دیکھنے کی ضد نہ کریں۔ وزیرِ خوراک وزراعت انہیں روٹی کی عدم دستیابی کی صورت میں کیک کھانے کا مشورہ دے سکتے ہیں اور وزیراعلیٰ تو ماشاءاللہ ان کے لئے تپتے ریگزاروں میں ایلیویٹڈ ایکسپریس وے تعمیر کرانے کا کہہ سکتے ہیں اس طرح ننگی زمین پر ان کے پاؤں جلنے کی نوبت نہ آئے گی اور وہ گرما گرم پتھریلی زمین کے تکلیف دہ سفر سے بچ کر فلائی اوور کی شکل والے پلوں پر اپنی بی ایم ڈبلیو با آسانی دوڑا سکیں گے۔

آئی ڈی پیز کا جس طرح کا پرخلوص استقبال اور خیال جناب رانا مشہود رکھنا چاہ رہے ہیں اس سے تمام پاکستانیوں کے دلوں میں خواہش پیدا ہو جانے کا احتمال ہے کہ کاش وہ بھی ٹی ٹونٹی جیسے انعامات حاصل کرنے کے لئے بے گھر ہو چکے ہوتے۔ کیونکہ مستقل گھروں میں رہنے سے تو وہ بے چارے پتنگ تک نہیں اڑا سکتے۔ چلو بے گھری کی برکات سے وہ کرکٹ تو کھیل لیں گے اور اسی طرح واقعی رانا صاحب کے ہاتھوں گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں ایک اور ریکارڈ کا اضافہ ہو جاتا کہ کس طرح پاؤں سے ننگے، بے لباس ننگ دھڑنگ آئی ڈی پیز نہایت دلجمعی سے کرکٹ کھیلتے پائے گئے اور ان کو جب بھوک لگتی تھی تو وقفے میں ورلڈ ریکارڈ کھا لیتے تھے۔ اور جب ان کی باعصمت بیبیوں، معصوم بچوں اور کمزور بوڑھوں کا مجبوراً لمبا سفر کر کے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں تو اس وقت ان کو مفت میں ٹی وی کوریج کا مستحق سمجھ کر کیمروں کے اردگرد گھمایا جاتا تھا نیز ان سے اس ٹی ٹونٹی میں شرکت کے لئے ٹکٹ بھی لینے کو نہ کہا جاتا تھا۔

ابھی تو اللہ کا شکر ہے کہ آئی ڈی پیز کی بے سہارا کیمپ زدہ زندگیوں میں اخبارات کا عمل دخل نہیں ہے وگرنہ ممکن ہے کہ چند ایک سر پھرے آئی ڈی پیز اپنی آرام دہ اور خوشحال زندگی پر رانا صاحب کے اس مشورے کو طنز سمجھ بیٹھتے اور کوئی نامراد الیکٹرونک جیکٹ پہن کر ان کو چھپی ڈال بیٹھتا اور پھر بہت ساری روحیں ٹی ٹونٹی کھیلنے فارن ٹور پر ملک عدم جا سدھارتیں۔ ہمیں ایسے لمحات میں ایک اور رانا یعنی جناب رانا ثناءاللہ صاحب کی یاد ستانے لگ گئی ہے۔ وہ اگر 'ان'' ہوتے تو یقیناً آئی ڈی پیز کے دکھ درد کو نہ صرف قریب سے سمجھتے بلکہ ان کے دکھوں کو دور کرنے کے لئے کچھ ایسے بیانات داغتے کہ آئی ڈی پیز کے بھوک کے مارے بلبلاتے بچوں، باپردہ مجبور ماؤں بہنوں اور معذوروں و بزرگوں کی جہنم جیسی زندگی میں بھی ہنسی چھوٹ جاتی اور اس طرح وہ وقتی طور پر اپنے دکھوں سے نجات پا جاتے۔ مرزا غالب سے معذرت کے ساتھ

ان کے مشورے سے جو آ جاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

کمسن گدھا

کمسن گدھے کے کان میں کیڑے پڑ گئے تو اُس کی ماں رونے لگ گئی۔ بچے نے حیرانگی سے پوچھا اماں کیا یہ کیڑے اتنے خطرناک ہیں؟ اُس کی ماں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا نہیں بیٹے تمہاری جدائی کا سوچ کر رو رہی ہوں کیونکہ مالک تُمھیں جلد ہی قصائی کے ہاتھ فروخت کر دے گا اور وہ تمھارا گوشت بکرے کا کہہ کر بیچ دے گا۔ معلوم نہیں کمسن گدھا یہ سُن کر گھبرایا یا نہیں اور نہ ہی ہم کمسن گدھے کی ماں کی گھبراہٹ ہمارا موضوع ہے۔ لیکن اُن یار لوگوں کی گھبراہٹ ہماری سمجھ میں آ رہی ہے جنہیں بعد میں پتہ چلا ہوگا کہ کل جو گوشت چسکے لے لے کر کھایا تھا وہ دراصل بیمار گدھے کا تھا۔

صحت مند جوان گدھے کی قیمت اسی وقت ایک لاکھ روپے تک پہنچا چاہ رہی ہے۔ لیکن بیمار گدھا دو کوڑی کا نہیں۔ لیکن اب گدھابانوں کے بھاگ جاگ گئے ہیں اور بیمار گدھا اب خاصہ قیمتی ہو گیا ہے کیونکہ اس پر بزنس مین کی نظر پڑ گئی ہے۔ شرط یہ ہے کہ گدھا ذرا کم عمر ہوتا کہ اس کے اور بکرے کے گوشت میں فرق محسوس نہ کیا جا سکے۔ ہمارے اپنے اندازے کے مطابق اب ہر عمر کا بیمار گدھا قیمتی ہو چکا ہے کیونکہ بے شمار چینی ورکر اور انجنیئر ز آج کل پاکستان کے چپے چپے میں کام کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری ہڈ بیتی ہے۔ ہمیں تونسہ بیراج کی مرمت اور آٹو میشن کے وقت ہمارے ماحولیاتی انسپکٹر نے اطلاع دی کہ چنکر بستی میں جس گدھے کے جسم میں کیڑے پڑ گئے تھے اُسے چینی پچاس روپے میں خرید کر لے گئے ہیں۔ ہم نے بروقت چینی انجنیئر ز کے ریسٹ ہاؤس پر چھاپہ مارا لیکن دیر ہو چکی تھی بس ہمیں گیراج کے قریب اس گدھے کی محض وردی ہی نظر آئی۔ اور اندر سے مدھر موسیقی میں چینیوں کے مست مست قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ ہمیں یہ سوچ کر ہی نفسیاتی طور پر ایسا لگا جیسے اندر سے بدبو کے بھبکے آ رہے ہوں اور ہم یہ جا وہ جا۔

ہمیں معلوم نہیں کہ ہم لوگ گدھے سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟ حالانکہ یہ صابر و شاکر ہے شریف النفس ہے۔ وزن اُٹھاتا ہے۔ مشرق بعید یعنی کوریا وغیرہ میں بسنے والے ہمارے بھائی بندوں کی مرغوب غذا ہے۔ ہمارے آقا ملک کی اکثریتی پارٹی کا انتخابی نشان ہے۔ یہ اسی گدھے کو اعزاز حاصل ہے کہ ہم اپنی قوم کے ان افراد کو بھی گدھے کے لقب سے یاد کرتے ہیں جنہوں نے کبھی بھی مادر وطن کو نقصان نہیں پہنچایا۔ صدیوں سے یہ غریب جانور ہماری نفرت کا نشانہ بن رہا ہے حالانکہ یہ عقدہ ابھی حال ہی میں کُھلا ہے کہ اس مظلوم مخلوق کو ہم بکرے کی جگہ گوشت کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ کیونکہ بکرے ذرا کم پڑتے جا رہے ہیں اور نخرے دکھلانے لگ گئے ہیں۔ ہم جب اس موضوع پر اظہار خیال کر رہے تھے تو انکل بدروح نے حیرانگی سے پوچھا کہ گدھا خاصہ مہنگا ہے اور بکرا سستا تو پھر ہوٹلوں میں گدھے کا گوشت کیوں سپلائی کیا جاتا ہے؟ اب ان کو کون سمجھائے کہ ہمارے ہوٹل اور گوشت بیچنے والے اڈے دراصل شہر لاہور میں صفائی ستھرائی کے محکمہ سالڈ ویسٹ مینجمنٹ کے اہم اتحادی ہیں وگرنہ روزانہ ہزاروں مرغیوں کے مرنے، گدھوں

،کتوں وغیرہ کی بیماریوں کا علاج کرنے اور قبرستانوں میں تازہ لاشوں کے جگہ گھیرنے سے لاہور متعفن ہو چکا ہوتا ۔یہ تو لاشوں کا کاروبار کرنے والوں کا اُن لاہوریوں پر احسان ہے جو شہر کو خادم اعلیٰ کی خصوصی ہدایت پر صاف رکھنا چاہتے ہیں ۔ہاں ان لاہوریوں کے لئے شاید ذرا مسکراہٹ کا باعث بن جائے جو گوشت کھائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے ۔

اب وطن عزیز میں نہ تو چینی صدر ماؤزے تنگ جیسا لیڈر موجود ہے اور نہ چینی قوم جیسی یگانگت کہ پچاس کی دھائی میں ملک سے چوہوں اور چڑیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے انہوں نے انہیں کھانا شروع کر دیا تھا اور جلد ہی مذکورہ گوشت کا ذائقہ اُن کی زبان پر رچ بس گیا ۔ ہمارے ہاں معاملہ ذرا سا مذہبی رنگ اختیار کر گیا ہے کہ کروڑوں بزرگوں نے نئی نسلوں کو یہ چکمہ دے کر گوشت کھانے پہ لگا رکھا ہے کہ گوشت تمام غذاؤں کا سردار ہے ۔ یہ کہہ کر اس پر عملدرامد کرانے سے انہیں نہ صرف ثواب حاصل ہوتا ہے بلکہ اپنے کہے ہی کی آڑ میں ہر طرح کا گوشت کے چٹخارے الگ ۔چینی لیڈر نے تو بعد میں اپنی قوم کو چڑیاں کھانے سے منع کر دیا تھا کیونکہ اس طرح فصلوں کو کیڑے مکوڑوں نے برباد کرنا شروع کر دیا تھا ۔لیکن ہم جس مقدس ہستی کا نام لے کر قوم کو گوشت خوری پر لگا رہے ہیں وہ عظیم انسان تو شاید سال بھر میں اتنا حلال گوشت تناول نہ فرماتے ہوں گے جتنا کہ حرام گوشت ہمارے لٹکے پیٹوں والے ہفتے بھر میں دوزخ شکم میں قید کر لیتے ہیں ۔

ہم دوسری حدیث کو نظر انداز کر چکے ہیں کہ جس میں انہوں ہی نے فرمایا تھا کہ گائے کے جسم سے تمہیں دو غذائیں ملتی ہیں جس میں سے ایک میں شفا (دودھ) دوسری میں وبا (گوشت) ۔

بہر حال ہم اپنے آپ کو صحت وغذا کے ماہر پوز کرنے کی بجائے دوبارہ میٹھے سچ کی طرف لوٹتے ہیں کہ ہمارے پاس اب گدھے یا دیگر مردہ گوشت سے بچنے کا واحد ایک ہی طریقہ ہے کہ گوشت کھانا چھوڑ دیں ۔اور یقین کریں ایسا کرتے ہی ہماری قوم میں بھی نوبل انعام لینے والے پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے ۔اور ہم بیماریوں سے بھی بچے رہیں گے ۔لیکن ساتھ ہی بیمار گدھوں کی بھی فکر ہے کہ ان کا کیا بنے گا؟ ۔

جانو جرمن

پچھلے ماہ جرمن وفد اپنے دورۂ لاہور کے دوران وزیر اعلیٰ پنجاب کی جرمن زبان میں گفتگو سن کر حیران رہ گیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حیران پریشان رہ گیا۔ چونکہ ہمارے محترم خادم اعلیٰ کو گڈ گورنس کے علاوہ ہر کام کرنے کا بے حد شوق ہے۔ بس انہوں نے کوئی چھ زبانوں میں مہارت حاصل کر رکھی ہے۔ اخباری اطلاع کے مطابق چونکہ جرمن وفد ان کی جرمن زبان زدگی سے حیران ہوا تھا تو اس بات سے ہمیں اندازہ ہوا ہے کہ موصوف وزیر اعلیٰ مذکورہ چھ زبانوں میں لفظ ''مہارت'' ہی بار بار بولتے رہے ہوں گے۔

ہم کبھی قیام پولینڈ میں فر فر پولش زبان بولا کرتے تھے اور یونیورسٹی میں وقفہ ءچائے میں دیگر ساتھی ہماری زبان دانی سے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ ہم اسی زعم میں مبتلا رہے کہ ہمارے سنائے گئے پولش زبان میں لطیفوں سے وہ خاصے محظوظ ہو رہے ہوں گے لیکن ایک ''رقیب رُوا بیض'' یعنی گورے منہ والے رقیب نے ایک بار یہ کہہ کر ہمارا موڈ ہی خراب کر دیا کہ تمہارے لطیفے کبھی بھی ہمیں سمجھ نہیں آئے ہم تو تمہاری ترک زبان دانی پر ہنستے رہتے ہیں۔ پہلے تو ہمیں خوشی ہوئی کہ یہ ہمیں ''جانو ترکی'' کی طرح ترک زبان کا بھی ماہر سمجھتے ہوں گے لیکن اس گدھے نے پولش کو ترکی کہہ کر جو گہرا گھاؤ لگایا تھا اس کی درد خاصی دیر بعد محسوس ہوئی۔ ہوسکتا ہے کہ جرمن وفد بھی وزیر اعلیٰ کے منہ سے چھ زبانوں کو مکس کر کے بولے جانے والے تمنجن سے حیران رہ گئے ہوں۔

زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں پروفیسر غلام احمد حریری صاحب ہمیں عربی زبان سکھایا کرتے تھے۔ ایک بار کہنے لگے کہ اگر آپ کو عربی کے ڈھائی سو سے چھ سو تک الفاظ یاد ہو جائیں تو سمجھ لیں کہ آپ عربی بول سکتے ہیں۔ استاد کی اسی بات کو سند سمجھتے ہوئے ایک بار ہم نے وارسا میں اپنے شامی پڑوسی سے یہ کہہ دیا کہ ہمیں عربی بھی آتی ہے۔ پوچھا کہ کتنے الفاظ؟ ہم نے عرض کیا کہ لگ بھگ ایک ہزار الفاظ، یہ سُن کر پہلے تو وہ جرمن وفد کی طرح حیران پریشان رہ گیا۔ مگر پھر زور سے عربی میں ہنسا۔ ہم کٹ کر رہ گئے کیونکہ اگر وہ مورکھ اردو میں ہنسا ہوتا تو شاید اس قدر سبکی محسوس نہ ہوتی۔ پھر ہمیں مزید جلانے کے لئے کہنے لگا کہ ''عربی میں تو صرف اونٹ کے لئے ہی نو سو الفاظ ہیں۔ ابھی تو تم اونٹ کے اوپر بھی نہیں چڑھے''۔ اس سے ہی ملتا جلتا واقعہ ہمارے ساتھ برلن میں پیش آیا۔ ایک شاوارما شاپ پر ہم آرڈر دینے سے قبل ''گٹن ٹاگ'' یعنی صبح بخیر کہہ بیٹھے۔ کیونکہ ہمیں بھی وزیر اعلیٰ کی طرح جرمن زبان پر ''عبور'' حاصل تھا اور ہم ''ڈانکے'' (شکریہ) اور ''ووِرہولن'' (خدا حافظ) جیسے الفاظ کی دولت سے مالا مال تھے۔ بس پھر کیا تھا اس شاوارمی حسینہ نے ہم سے اتنی جرمن زبان بول ڈالی کہ دو روز تک ہم قبض سے چھٹکارا نہ پا سکے۔ ہم سمجھتے رہے کہ یہ قبض شاوارما کھانے سے ہوئی ہے۔ لیکن اب سمجھ آتی ہے کہ اس خاتون کی تین منٹ میں بولی گئی تین سو جرمن الفاظ کے باعث ہوئی ہوگی۔ ممکن ہے کہ موجودہ

جرمن وفد بھی واپس جا کر ''ڈلکولکس'' کی گولیاں کھا کر ''باڈ'' (غسل خانے) میں جا بیٹھا ہو۔

صحیح الفاظ کے چناؤ سے روانی میں بولی جانے والی زبان کو ہی دراصل مہارت کہتے ہیں لیکن گمان ہے کہ ہمارے وزیراعلیٰ کے مسائل بھی شائد ہم سے ملتے جلتے ہیں۔ہم بھی تیز تیز بولنے کو قادرالکلامی سمجھتے ہیں۔اور کئی برس تک ہم تیز تیز پولش بولنے کی کوشش میں پنجابی ،اردو اور فارسی کے ٹانکے لگاتے رہے۔ہماری ڈاکٹریٹ کی پڑھائی و مقالہ وغیرہ چونکہ انگریزی میں تھا لہٰذا اپنے پروفیسروں سے تو پولش بولنے کی ہم جرأت نہ کر سکے لیکن سیکرٹری اور اسسٹنٹ ٹائپ لوگوں کو ہم ''جانو پولش'' بن کر خوب حیران کرتے رہتے تھے۔ایک بار ریکٹر کی سیکرٹری کسی پروفیسر کو بڑے وثوق سے بتا رہی تھی کہ مسٹر سلطان کو پولش زبان کے علاوہ ترکی اور فارسی بھی آتی ہے۔ہم نے اتنی مشکل سے ہنسی روکی کہ وہ پروفیسر سب کچھ سمجھ گیا ہوگا کہ یہ سیکرٹری پنجابی اور اردو کو شاید فارسی اور ترکی کہہ بیٹھی ہے۔ہوسکتا ہے کہ دورۂ لاہور میں جرمن وفد کے اراکین نے بھی اتنے زور سے ہنسی روکی ہو کہ آواز دور دور تک جاتی رہی ہو۔ہمارے ساتھ ایک اور واقعہ بھی ایسا ہی پیش آیا۔کراچی کی ڈینم جینز بنانے والی فیکٹری اقبال ٹیکسٹائلز کے نمائندہ مسٹر انیس دایانی مارکیٹنگ کے سلسلہ میں پولینڈ تشریف لائے۔ہم اس لئے ادب سے ان کا نام لے رہے ہیں کہ وہ ہمارے سنوکر کے استاد بھی تھے اور برسبیل تذکرہ یہ بھی بتاتے چلیں کہ بعد میں ہم جب بھی کوئٹہ میں سنوکر کھیلے لوگ اسے میز کا ''گلی ڈنڈا'' ہی سمجھتے رہے۔خیر سفارت خانے کی درخواست پر ہم اردو پولش ترجمان بن کر تین روز تک ان کے ساتھ مختلف شہروں میں گھومتے رہے۔ واپس وارسا آکر ہم نے ان کی درخواست پر اپنے وزٹ کے نتائج سے آگاہ کیا کہ آپ کی جینز یہاں بکنے والی نہیں۔کیونکہ ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ جب ہم آپ کی جینز کی خوبیاں بیان کر رہے ہوتے تھے تو کسٹمرز کا اندرونی غصے سے منہ سُرخ ہو جاتا تھا۔بلکہ کئی ایک تو بہانہ کر کے باتھ روم تک بھی گئے۔دایانی صاحب سادگی سے فرمانے لگے کہ ممکن ہے ان کا منہ مسرت سے سُرخ ہو جاتا رہا ہو؟ہم نے زیادہ بحث مناسب نہ سمجھی کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ ہمیں مہمان گردانتے ہوئے وہ ہمارے سامنے ہنسی سے لوٹ پوٹ نہ ہونا چاہتے ہوں گے۔اسی لئے واش روم پدھارتے رہے ہوں گے۔عین ممکن ہے کہ وزیراعلیٰ کی جرمن زبان میں دی گئی پریس کانفرنس کے بعد سارا جرمن وفد قطار در قطار واش روم یاترا پر نکل گیا ہو۔ واللہ علم بالصواب۔

وزیراعلیٰ کی جرمن دانی کی خبر نے نامعلوم ہمیں آج کیوں دیارِغیر کے کئی واقعات یاد دلا دیئے ہیں۔ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔کوپن ہیگن کے ایک بس سٹاپ پر ایک امریکی گورا ہاتھ میں بیئر کا ٹن پکڑے ہم سے بلامقصد گفتگو کئے جا رہا تھا۔شاید اسے ان دنوں یورپ میں امریکن سٹریٹ لینگویج سنانے کا موقع نہ ملا ہوگا۔باتوں ہی باتوں میں کہنے لگا کہ اگر کوئی زبان سے زبان ملائے تو اسے وہاں کی زبان آجائیگی۔اسکی وضاحت سے قبل ہی ہماری بس آگئی لہٰذا ہم آج تک اس بوڑھے امریکن کے محاورے کی تہہ تک نہیں پہنچ پائے تھے کہ اچانک اس کا شاخسانہ اس عید پر نمودار ہوا۔ہم نے اپنے بیٹے کے دوست سے ڈرتے ڈرتے ہی معانقہ کیا کہ کہیں وہ بولنے کی بجائے بھونکنا نہ شروع کر دے کیونکہ ہم نے اس کے بارے میں سُن رکھا ہے کہ اسے اپنا جرمن شیفرڈ کتا اس قدر پیارا ہے کہ اکثر اسی سے زبان ملاتا رہتا ہے۔

باقی واقعات پھر کبھی سنائیں گے۔فی الوقت کالم لکھنا بند کرتے ہیں کیونکہ جگہ ختم ہو رہی ہے۔ڈانکے مانکے

چھا نگے ۔ گٹن ناگ آو ورہمن ۔(اوو اگا) وکتور سو طان ناپی سا وات کالمادلا وشکو کولیگوف وتیتو ، جانو جرمناں ۔(ترجمہ)نوٹس : ڈاکٹر سلطان نے یہ کالم تمام دوستوں کے لئے لکھا ہے اور اس کا عنوان ہے جانو جرمن) ۔دوستو اب حیران ہونے کی آپکی باری ہے ۔

مولوی کنٹینر

اخباری دنیا میں رانا ثناءاللہ کے جانشین رانا مشہود نے طاہر القادری کو مولانا کنٹینر کا لقب دے دیا ہے۔ سیاسی دنیا بھی عجیب ہے جہاں بڑے سے بڑے سیاستدان کو بچوں جیسی حرکات سے کوئی روک نہیں سکتا۔ اب شاید ہی چند ایک سیاستدان اپنی آبرو بچا پائے ہوں لیکن لگتا ہے کوچۂ صحافت میں بھی سیاستدانوں کے وضو ٹوٹ چکے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے اس کوچہ تجارت کے بڑے بڑے حریف بھی ایک دوسرے کا نام نہ بگاڑا کرتے تھے۔ لیکن ہمیں یاد آ رہا ہے کہ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے کسی بھی سیاستدان کی عزت اچھالتے کسی دوسرے سیاستدان ہی کو دیکھا ہے سوائے ایک سیاسی جرنیل ضیاءالحق کے جنہوں نے ایک ہی فتوے میں تمام سیاستدانوں کو ''کتا'' کہہ کر آدھی عوام کے دل توڑ ڈالے۔ مثلاً انہوں نے بعد از تلاوت کلام مجید یہ بیان جاری کیا کہ تمام سیاستدان بکاؤ مال ہیں اور اگر میں ایک اشارہ کر دوں تو یہ تمام دُم ہلاتے ہوئے میرے پیچھے چلتے آئیں گے۔

قومی سیاستدانوں کے کچھ مزید اقوال زریں ہمیں یاد آ رہے ہیں مثلاً بھٹو نے مولانا شاہ احمد نورانی کو ''مولوی پیک (پان والی پیک)'' کا لقب دے ڈالا تو ساتھ ہی اصغر خاں کو ''آلو'' بھی کہہ دیا۔ شورش کاشمیری نے ذوالفقار علی بھٹو کو ''گھاسی رام'' کہا تو ساتھ ہی اس کی ساری کابینہ کو ''علی بابا چالیس چور'' کا اضافی خطاب بونس کے طور پر عطا کر دیا۔ مسرت شاہین نے مولانا فضل الرحمن کو ''مولانا ڈیزل'' کہنا مناسب سمجھا تو پرویز الٰہی نے شریف برادران کو ''ڈینگی برادران'' کہہ کر ان پر مچھر مار سپرے کرنے کی کوشش کر ڈالی۔ حافظ حسین احمد نے نواز شریف کو جب ''اللہ میاں کی گائے'' کہا تو ساتھ ہی ان کے کاؤنٹر پارٹ نریندر مودی کو ''بُل فائٹر'' کی تلمیح عطا کی۔ رانا ثناءاللہ نے عمران خان کو ''سونامی خان'' کہا تو جواباً تحریک انصاف کے کسی منصف نے ان کو ''خودکش جیکٹ'' کے مجاہدانہ لقب سے نواز دیا۔ فیصل آباد میں 1970ء کے الیکشن میں جماعت اسلامی کے مولانا کاکا خیل کو مخالف امیدوار نے مشورہ دیا کہ جا ''کاکا کھیل''۔ الطاف بھائی جونہی چند روزہ گرفتاری کی زد میں آئے تو شرجیل میمن نے ان کو ''بوری سرکار'' کہہ ڈالا۔ شاید ہی چند سیاستدان ایسے نکلے ہوں جن کے نام کو مزید بگاڑنے کی مخالفین کو ضرورت نہ پڑی ہو جیسے کہ مسلم لیگ کے لونڈ خوڑ کھنڈکر، بھارتی وزیر چدم برم، دیوگوڈا، روسی صدر پدگورنی یا پھر چرچنکو۔ باقی تو خیر بھی ایک دوسرے کی چادر اتارتے پائے گئے۔

ایسی خوش گپیاں کبھی کبھار عالمی سطح پر بھی دیکھی یا سُنی جاتی رہی ہیں۔ مثلاً باکسر محمد علی کلے نے جاپانی پہلوان انوکی کو اس کی ٹھوڑی کی مناسبت سے ایک سمندری پرندے ''پیلیکن'' سے تشبیہ دے ڈالی۔ ایک نیگرو باکسر جو فریزر نے محمد علی کلے کو جب طعنہ دیا کہ یہ اپنے کالے رنگ سے خوب فائدہ اٹھاتا ہے تو جواباً کلے نے کہا کہ تمہیں چاہیے کہ اپنا منہ

امریکن محکمہ جنگلی حیات کو تحفہ کردو۔ چرچل نے آدھی پارلیمنٹ کو جب ''گدھے'' کا خطاب دے ڈالا تو اراکین کے پرزور احتجاج پر اپنے الفاظ اس طرح واپس لئے کہ دراصل آدھے ارکان گدھے نہیں ہیں۔ دنیا کے اعلیٰ ترین دماغوں میں سے ایک نوبل انعام یافتہ سائنسدان آئن سٹائن کو جب اس وقت کی حسینۂ عالم نے شادی کی آفر دیتے ہوئے یہ منطق دی کہ میں چاہتی ہوں کہ ہماری اولاد کے ذہن آپ جیسے اور شکل میرے جیسی ہو تو انہوں نے انکار کرتے ہوئے جوابی منطق پیش کی کہ نہ بی بی اگر الٹا ہو گیا تو پھر کیا بنے گا؟ امریکی صدر جنرل آئزن ہاور نے روسی آمر خروشچیف کو اقوام متحدہ کے اجلاس میں جب ''برفانی ریچھ'' کہا تو اس نے تڑپ کر روسٹرم پر جوتے برسانے شروع کر دیئے۔

غالباً ''بی بی'' یعنی بےنظیر وہ واحد سیاستدان تھیں جنہوں نے سب سے زیادہ ذومعنی الفاظ استعمال کئے۔ مثلاً وہ نواز شریف کو ''این ایس'' یعنی نان سینس، فاروق لغاری کو ''ایف ایل'' یعنی فرنچ لیڈر، آرمی کو ''واچ ڈاگ'' اور عدالتوں کو ''کینگرو کورٹس'' کہا کرتی تھیں۔ اور نواز شریف کے قریبی رفقاء کو ''فور ایس'' کا ٹولہ کہتی تھیں۔ یعنی شہباز شریف، سرتاج عزیز، سیف الرحمن اور شیخ رشید۔ اسی طرح کی کئی ایک یکطرفہ جگتیں کئی بار اخبارات کی زینت بھی بنیں۔ یعنی مولانا مفتی محمود نے جماعت اسلامی کے انتخابی نشان ترازو کے بارے میں کہا کہ جماعت کا اصل ایجنڈا حکومت ہے یقین نہ آئے تو ترازو کو الٹ کر کے دیکھیں ''وزرات'' میں بدل جائے گا۔ مولانا مودودی کو غلام غوث ہزاروی ''مردودی'' کہا کرتے تھے تو شورش کاشمیری مشرقی پاکستان کے مولانا بھاشانی کو ''مولانا بھاشن'' کہتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو ایوب خان کو ''ڈیڈی'' کہتے تھے اور وہ انہیں پیار سے ''زلفی'' کہتے تھے۔ ایک بار فیصل آباد کے ایک جلسہ عام میں ایک بازو سے محروم سیاست دان ایم حمزہ نے کوثر نیازی کو ''نوسر بازی'' کہہ دیا تو جواباً وہ انہیں ''ٹنڈا'' کہنے لگ گئے۔ بےنظیر کے پہلے دور میں ان کے شوہر نامدار آصف زرداری کی ہفت روزہ ''ٹائمز'' کے صفحہ اول پر لگی تصویر کے نیچے ''مسٹر ٹین پرسنٹ'' لکھا دیکھا گیا۔ اس پر تمسخر اڑانے پر ازاں بعد نواز شریف کو زرداری صاحب ''مسٹر ہنڈرڈ پرسنٹ'' کہنے لگ گئے۔ کسی دل جلے نے امپورٹڈ وزیراعظم شوکت عزیز کو ''مسٹر کشکول'' کہہ دیا تو کسی دوسرے نے معین قریشی کو ''میڈ ان ورلڈ بنک'' کہہ ڈالا۔ جب پنڈی کے لوگوں نے محبت سے شیخ رشید کو ''فرزند پنڈی'' کا خطاب دیا تو ن لیگ نے ان کو ''رشید اٹلی'' کہنا شروع کر دیا۔ ایک بار اخبار میں جنرل مشرف کی تصویر چھپی جس میں انہوں نے بغل میں ''کتا'' دبا رکھا تھا مگر بیان یوں تھا میرے آئیڈیل ''اتاترک'' ہیں بعد میں کسی بذلہ سنج نے اسی اخبار میں لکھ بھیجا کہ ''صاف ظاہر ہے''۔ زرداری نے جب ق لیگ کو ''قاتل لیگ'' کہا تو کسی دل جلے نے ان کو ''مداری'' کے منافع بخش لقب سے یاد کر لیا۔

شاعر حضرات تو خیر لفاظی اور بذلہ سنجی میں خاصے معروف رہے ہیں۔ اکثر قارئین نے شاید اپنی درسی کتب میں پڑھا ہو گا کہ اندھے استاد نے کسی شعر کا ایک مصرعہ تو کہہ دیا کہ ''اس زلف پہ پھبتی ہے شب دیجور کی سوجھی'' لیکن دوسرا مصرعہ ان سے بن نہیں پا رہا تھا۔ اس پر قریب بیٹھے شاگرد نے شعر یوں مکمل کر دیا کہ ''اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی''۔ ہم خود کوئٹہ کے سرینا ہوٹل میں ایک مشاعرے میں موجود تھے کہ بلوچستان کے مشہور شاعر جناب عطا شاد کو امداد نظامی نے کوئی چوٹ کر دی۔ انہوں نے زہر آلود انداز میں مسکراتے ہوئے فی البدیہہ شعر کہہ دیا ''مجھ سے بڑھ کر اگر کوئی حرامی ہو گا تو یقیناً وہ امداد نظامی ہو گا''۔ یہ وہی حضرت تھے جنہوں نے ہمارے ادارے بی آر ایس پی، کو

''بیٹر پی کے آئی'' کہہ ڈالا تھا۔ سابق گورنر پنجاب غلام مصطفیٰ کھر کے مخالفین کے دریافت کردہ نام ''گھر'' کو جب ہمارے ایک کلاس فیلو نے بھری کلاس میں بھی دہرا ڈالا تو ہمارے انگریزی کے استاد مرحوم ظفر اقبال سیخ پا ہو گئے اور انہوں نے کئی سیاستدانوں کے ناموں کی گردان ایک ہی سانس میں کر ڈالی یعنی ''امیر زادے، پیرزادے، نوابزادے، حرامزادے'' تک کہہ ڈالا۔ ہمارے کالج میں پروفیسر ٹی ایم خان کو طلباء ''ٹنڈ محمد خان'' اور چوہدری نذیر گل کو ''سی این جی'' کہتے پائے گئے۔ متحدہ مجلس عمل (ایم ایم اے) کو سرِ عام ''ملاں ملٹری اتحاد'' کا نام دیا جاتا رہا۔ بھارتی وزیر خارجہ سورن سنگھ کو بہت عرصہ ہمارے ایک کالم نگار ''سور سنگھ'' لکھتے رہے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے جب فیصلہ کر لیا کہ ڈاکٹر مبشر حسن کو اب فارغ کر دینا ہے تو چین سے واپسی پر ائیر پورٹ پر ان کو دیکھتے ہی کہا ''بائی بائی مسٹر چنگ چی سین''۔ قاضی حسین احمد مرحوم کو شیخ رشید نے ''مولوی دھرنا'' کی پھبتی کس دی اور پھر یہ بھی چشم فلک نے دیکھا گیارہ برس تک ملک عزیز پر حکومت کرنے والے ایک جرنیل سے اس کے پوتے نے پوچھا ''لوگ آپ کو کانا کیوں کہتے ہیں؟'' اور دوسرے گیارہ سالہ جرنیل پر کسی نے پھبتی کسی کہ ''کانے جرنیل'' کو اقتدار میں آنے کا رستہ نظر آ گیا ہے لیکن اب دوسری آنکھ نہ ہونے کے باعث جانے کا نہیں نظر آ رہا۔

قارئین کرام آج ایک ہی نشست میں ہماری یادداشت پر ڈھیروں انکشافات قطار در قطار بوندوں کی مانند ٹپک رہے ہیں اور بارش ہے کہ رُکنے کا نام نہیں لے رہی مگر ہمارے موٴقر اخبار کی ہمیں الاٹ کردہ جگہ چھوٹے ڈیم کی طرح ذرا جلد بھر جاتی ہے اس لئے خدا حافظ۔

خالص دودھ سے نکلی کریم

ہمارے عزیز دوست حسنین جاوید (تیغ قلم والے) نے عید والے دن فون پر اپنی تعریف کا پہلو کچھ یوں نکالا اور ہم سے ہاں سے ہاں ملوانے کا کوئی رستہ بھی نہ چھوڑا جب فرمانے لگے "دیکھئے ناں آپ ہوئے ہم ناچیز ہوئے اور فلاں فلاں صاحبان۔ یہی تو پاکستان کی کریم ہے"۔ بُرا ہو ہماری حاضر جوابی کا جوان کو اندرون خانہ ناراض کر گئی ہوگی جب ہمارے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ حسنین صاحب اگر ہم جیسے لوگ کریم ہیں تو اندازہ کریں کہ دودھ کیسا ہوگا؟"۔ موصوف خاصی دیر خط اُٹھائے رہے اور فون اس تاکید کے ساتھ بند کیا کہ اس پر کالم ضرور ہونا چاہیئے۔ بس ہم آج ہی لکھنے بیٹھ گئے ہیں کہ مبادا وہ خود نہ اپنے کالم میں اس 'کریم' کا تیاپانچہ کرنے بیٹھ جائیں۔

ڈیری سے وابستہ بعض فیکٹریاں جانور سے حاصل شدہ خالص دودھ سے حسب توفیق کریم نکال کر اس کو الگ بیچ کر منافع کماتی ہیں اور 'آم کے آم گٹھلیوں کے دام' کے مصداق بچے کھچے پھوکے دودھ کو بھی بیچ کر مال بناتی ہیں۔ یہ فارمولا سب سے پہلے بھاری مینڈیٹ والے منتخب جمہوری وزیر اعظم جناب بھٹو شہید نے استعمال کر کے افرادی قوت ایکسپورٹ کر دی اور دوہرا فائدہ اٹھایا۔ یعنی بے روزگار ووٹروں سے جان بھی چھوٹ گئی اور الٹا ملک میں دولت آنا شروع ہوگئی۔ یہ کاروبار اس قدر منافع بخش ثابت ہوا کہ پھر بعد میں کسی بھی فوجی آمر یا جمہوری آمر نے اسے روکا نہیں بلکہ مزید بڑھا دیا اور سرکاری طور پر یہ راگ الاپا جاتا رہا ہے کہ اتنے ارب اور کھرب زرمبادلہ ان محنت کش پاکستانیوں کے ذریعے ملک میں آرہا ہے۔ اس راگ کے اندر شاید ہی کسی نے جھانکا ہو کہ اگر یہی افرادی قوت اور خالص دودھ کی خالص کریم اگر وطنِ عزیز میں رُک کر معیشت کی ریڑھ کی ہڈی بنتی تو ہمارے ملک کی مجموعی پیداوار اور ترقی موجودہ تین فیصد سے بڑھ کر نوفی صد ہو چکی ہوتی۔ جیسا کہ چین، کوریا، بھارت اور ملائشیا میں ہوا ہے۔ مگر ہمارے بھٹو صاحب سے لے کر موجودہ حکمرانوں تک سبھی بہترین ڈاکٹر ہیں کہ جنہیں معلوم ہے کہ خالص دودھ پی کر یا خالص ملائی کھا کر تو صرف ہارٹ اٹیک ہی کرایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا یوں کرتے ہیں کہ خالص کریم ترقی یافتہ ممالک کے حوالے کر کے ان کو مزید ترقی یافتہ اور اپنے اوپر مزید آقا بننے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اور خود پھوکے دودھ میں موجود کیلشیم سے اپنے اقتدار کے ایوانوں کی ہڈیاں مضبوط کر لیتے ہیں اس طرح تین فائدے۔ اول خالص کریم ملک میں بے روزگار رہ کر ہمارا دماغ چاٹ کر چاند جیسی چُندیا نہ بنا سکے گی۔ دوم مفت میں اربوں روپے کا زرمبادلہ کما سکیں گے جو صرف حکومت میں موجود خاندان کھائیں گے۔ اور عوام کے لئے 'ڈڈو مویا'۔ اور سوم ملک کے اندر ہم مزید دو اہم کام کر سکیں گے۔ پہلا یہ کہ خود فیٹ فری دودھ پی کر اقتدار کی ہڈیاں مضبوط رکھیں گے۔ دوسرا 'عوام کو پلانے کے لئے ہم مصنوعی دودھ ایجاد کر کے پلانا شروع کر دیں گے جس سے ان کے اندر رہی سہی حمیت' کمیت اور جمعیت کو آسانی سے میّت میں بدل دیں گے۔ ظاہر سی بات ہے جو جمہور

کی خالص کریم نکال باہر کر کے پانچوں انگلیاں گھی میں ڈبوئے رکھے اسی کو جمہوری لیڈر کا بھی عہدہ ملے گا۔ دیکھئے بھٹو صاحب کا یہ فارمولا اس قدر طاقتور ثابت ہوا کہ کسی فوجی لیڈر نے بھی اس میں ترمیم کرنے کی ہمت نہیں کی۔ حالانکہ متفقہ آئین میں درجنوں ترمیمیں کر چھوڑیں بس نہ رہا بانس اور نہ بانسری یعنی کارآمد افرادی قوت اس لئے ملک میں نہ رہنے دی کہ انڈسٹری نہیں ہے۔ اور انڈسٹری اس لئے نہیں لگنے دی کہ پڑھی لکھی افرادی قوت نہیں رہی۔ لہٰذا قوم اس گنجے کی مانند مسلسل حالتِ غم میں رہی کہ جسے غم اس بات کا تھا کہ بال جھڑ رہے اور بال اس لئے جھڑ گئے کہ وہ حالتِ غم میں رہا۔ ایوب خان کی تیزی سے بڑھتی معاشی ترقی کے غبارے سے بھٹو صاحب کی صنعتیں قومیانے والی پالیسی کی سوئی مار کر ہوا اس لئے نکال دی کہ صرف بائیس خاندان ہی کیوں امیر تر ہوتے چلے جائیں؟ اور پھر بعد میں بائیس خاندانوں کے بائیس سو خاندان اس لیے بنا دیئے کہ آخر دوسروں کا بھی تو امیر ہونے کا حق تھا۔ چونکہ معیشت کی ریڑھ کی ہڈی جان بوجھ کے توڑ دی گئی تھی اس لئے 'خالص کریم' کے بھیجے گئے زرمبادلہ کو بھی تو کسی نے استعمال میں لانا تھا لہٰذا حکمران خاندانوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ کرنا عین ثواب سمجھ لیا گیا۔

اب چلتے ہیں بقیہ کالم کی جانب پہلے کہیں مصنوعی دودھ کا ذکر ہو چکا ہے یہ اس عیار کاروباری طبقے کی ایجاد ہے جو ہر وقت اس نکتے پر نظر رکھتا ہے کہ عوام کی کس مجبوری کو اپنی ذاتی دولت میں منتقل کرنا ہے۔ عزرائیل کو مصروف کرنے والے اور عوام کو چونا لگانے والے چند لوگوں نے غضب کا دماغ استعمال کر ڈالا اور عوام کی صحت پر 'ضربِ عضب' لگا ڈالی انہوں نے دو کلو انتہائی گھٹیا اور سستے درآمد شدہ خشک دودھ میں ایک لیٹر کھانے والا گھٹیا تیل اور 37 لیٹر پانی کے آمیزے سے جدید دودھ ایجاد کر ڈالا ہے۔ جس کی خبر عوام کے ساتھ ساتھ بھینسوں کو بھی نہیں ہونے دی۔ اور ثبوت یہ ہے کہ لاہور، کراچی، پنڈی، پشاور جیسے بڑے شہروں کے عوام کے ساتھ ساتھ کٹڑے بچھڑے بھی اس دودھ کو غٹا غٹ پیے جا رہے ہیں اور وہ بھی چائے بنا بنا کر تا کہ اس مصنوعی دودھ کے ساڑھے سات فی صد گھٹیا غذائی اجزا بھی اگر کوئی کارآمد جزو بدنی مضبوط بنانا چاہیں تو چائے کی کیفین کے سبب بنا نہ پائیں۔ غور کریں تو یہ ملک میں بچ جانے والی اس خالص کریم کا کمال ہے جو ہمارے سسٹم کے سبب غلط راستے پر چل پڑی ہے۔ اور اب اپنے ذہن کی تمام طغیانیوں کو بروئے کار لا کر نت نئی منفی ایجادات کر رہی ہے۔ اب قوم کی ہڈیوں کی مضبوطی کا یہ حال ہے اگر کوئی زور سے چھینک مار لے یا عید پر زوردار معانقہ کر لے یا کوئی کافر ادا زوردار انگڑائی ہی لے لے تو 'چک' 'ڈلوا لے یا'' لک' 'تڑوا بیٹھے اور اور کچھ نہیں تو اس قدر پٹھے کھنچوا بیٹھے کہ معالجین بالخصوص فزیو تھراپسٹ کی چاندی ہو جائے۔ ہم اپنی جان اور آن کی حفاظت کی خاطر جان بوجھ کر ڈبے کے دودھ کی حقیقت کھولنا نہیں چاہ رہے کیونکہ بارہ برس قبل ایک ہیلتھ میگزین میں ہماری تحقیقات تین اقساط میں چھپیں تو ملک کی ایک بہت بڑی ڈیری کمپنی سے جان بچانے کے لئے ہمیں تین ہی درجات تک پہنچ کر جان بخشی کرانا پڑی۔

موجودہ دور کے اس ناخالص دودھ پر اگر اصلی ملائی ڈھونڈنی پڑے تو یقیناً قاری منیب اور علامہ پوپلزئی کی ان دوربینوں کا سہارا لینا پڑ سکتا ہے کہ جن کے سبب اگر چاند نظر نہ بھی آئے تو محبوب ہی کو چاند کہہ کر عید کا اعلان تو شائد کیا جا سکتا ہو۔ اور یہی وہ دودھ ہے کہ جس کی کریم ہم جیسے 'دانشور' ہیں اور جن کے فرمودات سے اخبارات بھرے پڑے

ہیں۔اور ٹی وی کی رونقیں قائم ہیں۔اور ہم جیسے دانشور لکھتے اور بولتے بھی اس زعم سے ہیں کہ وہ میکاؤلی کی گل بکاؤلی ہیں۔لیکن پڑھنے اور دیکھنے والوں نے اپنا رُخ موڑ کر اب ''فیس بک'' کی طرف کر لیا ہے۔اب تو کالم لکھنا محض ٹھرک رہ گیا ہے اور یہ اس قدر بے جان کوچہ صحافت ہے کہ لکھنے والے کو ہر دم کسی لفافے کا انتظار رہتا ہے تاکہ اس کا پیٹ بھرے تو ذہن کُھلے اور قلم چلے۔

ڈپٹی کمشنر نواز شریف

کسی ملک کا ایک سرمایہ دار بار بار حکمران بن جاتا تھا چونکہ اسکی زندگی محنت مشقت سے عاری تھی لہذا حکمران بنتے ہی سب سے پہلے وہ دو کام کرتا تھا۔ پہلا تو یہ کہ اپنے پچھلے سرمائے کو چار گنا کرتا تھا اور اس کام کیلئے اُسے جو جتن بھی کرنے پڑتے تھے کرتا رہتا تھا۔ دوسرا کام ذرا مشکل سا تھا لیکن وہ بادشاہ بننے کے شوق میں کرتا ضرور تھا اور وہ یہ کہ جس سپاہ کو ملک کی حفاظت کیلئے مضبوط رکھنا ضروری ہوتا تھا اُس کو اپنے اقتدار میں رکاوٹ سمجھ کر گھوڑے کی طرح بم کو دولتی جھاڑ دیا کرتا تھا۔

پہلی دفعہ حکمرانی میں جب اُس نے بم کو لات ماری تو اتفاق سے بم پھٹ نہ سکا اور دور جا گرا۔ لیکن لڑھکا اس انداز سے کہ یہ بادشاہ سلامت خود اس پر سے پھسل کر اوندھے منہ حکومت سے باہر جا گرے۔ دوسری دفعہ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی بادشاہ سلامت نے وہی حرکت کر ڈالی۔ اس بار بم پہلے سے ذرا ہوشیار تھا لہذا اُس کی ٹھوکر سے بچ تو گیا لیکن ذرا گھوما اس انداز سے کہ اُس کی پشت پر جا پھٹا۔ جب بادشاہ سلامت دوسری بار بھی اُڑتے ہوئے ایوان اقتدار سے باہر جا گرے۔ جب بادشاہ سلامت کو تیسری بار حکمران بننے کا شوق چرایا تو بم پہلی دو ٹھوکریں کھانے کے بعد اب کی بار صرف زیادہ ہوشیار ہی نہ تھا بلکہ غصے سے شرابور بھی تھا۔

تیسری بار حکمران بنتے ہی بادشاہ سلامت کا سرمایہ تو کئی سو گناہ سے بھی زیادہ بڑھ چکا تھا لیکن اُس دولت کے نشے نے انہیں وہ تمام سابقہ سبق بھلا دیئے کہ جنکی بنا پر اُن کو فائر کیا جاتا رہا تھا۔ حالانکہ اس بار وہ پختہ ارادہ سے آئے تھے کہ اب مر کر ہی اقتدار سے جدا ہو نگے۔ قدرت نے بھی شاید ان کی خواہش قبول کر لی تھی اور انہیں مر کر ہی اقتدار سے ہٹانے کا فیصلہ لکھ دیا تھا۔ بادشاہ سلامت نے حسب سابق اپنی عادت کو نہایت پائیداری سے دہرایا اور سرمایہ چار گنا کرنے کیلئے اپنے درجنوں رشتہ دار اس کام پر لگا دیئے پھر موقع پاتے ہی تاک کر بم کو پھر سے دُولتی جھاڑ دی۔

اب کہ بار بم نے خود پھٹنے کی بجائے بادشاہ سلامت کا پٹاخہ بجانے کا فیصلہ کر لیا اور ان کی رسید کردہ لات کو اپنے دو چھوٹے بموں کے حوالے کر دیا۔ دونوں چھوٹے بموں نے اشارہ پاتے ہی دو مخالف سمتوں سے بادشاہ سلامت پر حملہ کر دیا اب پوزیشن خاصی دلچسپ ہو چکی تھی ایک بم اگلی جانب سے حملہ آور ہو کر پھٹنے جیسی ایکٹنگ کرنے لگ گیا اور دوسرے چھوٹے بم نے پشت پر چپک کر چپی شروع کر دی اور پھٹنے کی اداکاری کرتے کرتے بادشاہ سلامت کو اس قدر زچ کر دیا کہ وہ ہاتھ باندھ کر سر کے بل اپنے ہی قدموں پر یوں جھک گئے کہ بادی النظر میں یوں نظر آنے لگ گئے کہ جیسے دونوں چھوٹے بموں سے معافی کے خواستگار ہوں مگر حقیقت میں انہوں نے بڑے بم سے ایک بالکل انوکھی درخواست کر دی کہ اے بم اگر تم اس بار مجھے معاف کر دو تو میں بادشاہ سے چپڑاسی بننے پر بھی رضامند ہوں۔

بادشاہ سلامت کو اس حد تک زچ کرنے پر سپاہ کو بھی شاید پیار آ گیا۔اس نے انتہائی شائستگی سے اس کی انوکھی پیش کش کے سبب اسے یہ فیصلہ سنا کر حکمرانی اپنے ہاتھ میں لے لی کہ اے حکمران آئندہ سے دیکھنے میں تم بادشاہ ہی نظر آؤ گے لیکن درحقیقت تمہارے اختیارات گھٹا کر لاہور کے ڈپٹی کمشنر کے برابر کر دیئے جائیں گے۔اس طرح راوی چین ہی چین لکھنے لگ گیا تاہم بم نے پھٹنے سے اور بادشاہ سلامت نے لات مارنے کے لئے اگلے کئی برسوں تک توبہ کر لی۔

ڈاکٹر کا علاج

ڈاکٹر بھی آخرانسان ہوتے ہیں لہٰذا جب بیمار پڑتے ہیں تو اپنا علاج کرنے کی بجائے دوسرے ڈاکٹروں سے مشورہ لیتے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کو اپنے علاج سے مرنے کا خطرہ ہوتا ہے ۔سیانے کہتے ہیں کہ کوئی بھی پاس نہ ہو تو گھٹنے سے یا دیوار سے مشورہ لے لینا چاہیئے ۔بس بیمار ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر کو گھٹنا اور دیوار سمجھ کے ہی مشورہ کرتے ہیں اوپری فائدہ یہ کہ فیس بھی معاف۔

دراصل ڈاکٹر کو پیشے کی بجائے پیسے کو آن کا مسئلہ بنانا چاہیئے ۔ورنہ گھوڑا تو گھاس سے دوستی کرکے بھوکا ہی مرے گا۔مریض کے لئے ڈاکٹر،سائل کے لئے وکیل،شاگرد کے لئے استاد اور تماشائی کے لئے اداکار اگر سچی مچی وہی کرنے لگ جائیں جو ان کا پیشہ اور انصاف کہتا ہے تو ان کے گھروں میں چاڈ جیسی فاقہ کشی والا حال ہو جائے گا۔رواداری اور مفت کے مشورے ڈاکٹر کو زیب نہیں دیتے کیونکہ اس قسم کی نیکیاں اس کی کار اور وقار کے خلاف ہیں ۔چونکہ ہماری بھولی بھالی قوم ڈاکٹر کے ہاتھوں مرنے کو اب بھی اللہ ہی کی رضا سمجھتی ہے اس لیے ڈاکٹر کو چاہیے کہ فارما کمپنیوں کے پڑھائے گئے سبق کی روشنی میں کوئی ملفوف قسم کی اداکاری کرتے ہوئے انکی زیادہ سے زیادہ ادویات بیچے مگر موئے مریض کو بھی مطمئن رکھے۔اور اس طرح پل صراط پر چلتے ہوئے دنیا بناتا چلا جائے ۔ویسے تو اگر ڈاکٹر نہ ہوتے تو شائد انسانیت بلکتی رہتی لیکن یہ بھی ایک طرفہ تماشہ ہی سمجھیں کہ ایک بار کسی بڑے سرکاری ہسپتال کا یہ واقعہ اخبارات کی زینت بنا کہ ڈاکٹروں کی ہڑتال والے دن باقی تمام دنوں کی نسبت شرح اموات نہایت کم رہی ۔بس اگر ڈاکٹر کی چھٹی تو پھر سمجھیں کہ عزرائیل کی بھی آدھی چھٹی ۔اس کو کہتے ہیں ڈاکٹری پیشے کا تقدس کہ ڈاکٹر کی آہ عرش خداوندی تک بھی پہنچ سکتی ہے۔

ہمیں اس وقت خاصی خجالت ہوتی ہے کہ جب انکم ٹیکس آفیسر،ڈپٹی کمشنر یا کوئی سفیر ڈاکٹر نکل آتا ہے ویسے تو یہ سونے پر سہاگے والی بات ہے بلکہ سہاگے کے اوپر سونے والی بات ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کہ قوم کے لاکھوں روپے کے سرمائے سے ڈاکٹر بننے کے بعد اور لاکھوں روپے کمانے کے کے بیشمار چانسز کے باوجود آخر وہ کون سی ایسی کشش ہے جو ایک ڈاکٹر کو سول سروس میں کھینچ لاتی ہے؟اس کا جواب ہمارے ایک ہم پیشہ ڈاکٹر نے پتے کی بات بتا کر ہمیں لاجواب کردیا کہ اچھا بزنس مین منافع دیکھتا ہے بزنس کی قسم نہیں دیکھتا۔یہ وہی صاحب تھے جو ڈاکٹر بننے کے بعد آڈٹ آفیسر بنے اور بہتی گنگا میں اتنا نہائے کہ بالآخر ڈوب جانے کے خوف سے حج پر چلے گئے ۔وہاں دوستوں کے متنبہ کرنے پر کینیڈا کی شہریت لے کر تب پلٹے جب ان کے خلاف درجنوں الزامات سیاسی طور پر مٹا دیئے گئے تھے۔بہر طور موصوف حاجی ڈاکٹر کے ایمان افروز جواب سے ہمارے من کو جھٹکا تو لگا اور ایسے کئی واقعاتی جھٹکوں کے بعد جب

نیویارک میں ہمارے ہم فلیٹ ٹیکسی ڈرائیور بھی ڈاکٹر نکل آئے تو یقین مانیں پھر بالکل جھٹکا نہ لگا۔

ایک حالیہ سروے سے پتہ چلا کہ ملک عزیز میں ایک لاکھ چوبیس ہزار ڈاکٹر صاحبان پائے جاتے ہیں۔ بیس کروڑ میں یہ تعداد جب ہمیں کم لگی تو ڈاکٹر خطائی نے پھر دخل در معقولات کیا اور فرمایا کہ اگر نوع انسانی کے آج تک کے پندرہ بیس ارب انسانوں کو ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں نے سنبھال لیا تھا تو پاکستان میں کیا پرابلم ہے؟ بات تو سچ ہے مگر ہے رسوائی کی۔ کیونکہ ہر نبی کے جانے کے بعد اس کی قوم نے اس کے نام سے اپنے مفادات والے مذاہب ایجاد کر لئے۔ ہم نے ڈاکٹر خطائی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے عرض کی نوع انسانی نے اب مزید نبی مانگنے بند کر دیئے ہیں۔ لیکن مزید ڈاکٹر مانگتی رہتی ہے تاکہ وہ عوام الناس کا علاج اسی کے دیئے گئے ٹیکس سے پڑھ لکھ کر کرنے کی بجائے سول سروس کا امتحان دے کر بیوروکریٹ بن کر بہتر انداز سے کر سکیں۔ کیونکہ جو شان کالے انگریز کی ہے ایک معالج کی کہاں۔ معالج تو کسی کو زیادہ سے زیادہ قبر میں دھکیل سکتا ہے جہاں ہر احساس مٹنے کے ساتھ ساتھ شرمندگی کا احساس بھی مٹ جاتا ہے۔ لیکن صاحب اقتدار بیوروکریٹ ڈاکٹر کسی کو بھی پس دیوار زنداں دھکیل کر تمام عمر شرمندہ رہنے پر مجبور کر سکتا ہے۔

پانچ دس برس ڈاکٹری پڑھنے کے بعد اگر ڈاکٹر پیشہ ورانہ بدنامی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دوسرے پیشے میں گھس ہی بیٹھے تو لاکھ کوشش کے باوجود وہاں بھی کہیں نہ کہیں ڈاکٹری ضرور گھولے گا۔ فرض کریں ڈاکٹری کرنے کے بعد اگر وہ بیورکریٹ بن جائے تو کسی فائل پر نوٹنگ کرتے کرتے اس کا قلم لڑھک سکتا ہے اور ممکن ہے وہ کسی ماتحت کو سسپنڈ (معطل) لکھنے کی بجائے سسپینشن (محلول) لکھ دے یا میٹنگ کا ٹائم دیتے ہوئے لکھ دے کہ ''صبح دو پہر شام کھانے کے بعد''۔ یا اگر وہ پولیس سروس میں چلا جائے تو اپریشن کلین اپ کی بجائے اپریشن 'سپلین کٹ' (یعنی لبلبہ نکال) بول دے۔ اگر وہ کسٹمز میں ہے تو انسپکشن کا کہنے کی بجائے یہ ہدایت جاری کر دے کہ ''میں تین بجے راونڈ پر آ رہا ہوں''۔ اگر زراعت یا لائیوسٹاک کے محکمے میں ہو تو سپرے اور ویکسی نیشن (حفاظتی ٹیکوں) کے ساتھ بے خیالی میں زخم اور شیر خوار بچوں کا بھی ذکر کر دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر وہ نیویارک یا کوپن ہیگن میں ٹیکسی چلا رہا ہو تو انجن کا درجہ حرارت ناپنے کے لئے تھرمامیٹر لینے چلا جائے۔ اگر بزنس مین بن جائے تو تولیہ ایکسپورٹ کرتے وقت ساتھ میں درجن بھر پٹیاں یا روئی کے بنڈل رکھ دے۔ اگر مسجد میں پیشِ امام بن جائے تو اوور آل پہن کر آ جائے۔ دوکاندار بن جائے تو گاہک کے دانت نکال باہر کرے۔ کرکٹر بن جائے تو چوکا لگانے کے بعد ناظرین سے فیس کا مطالبہ کر دے۔ ٹی وی آرٹسٹ بن جائے تو ہر سین کے بعد جا کر کینٹین میں بیٹھ جائے۔ بنکار بن جائے تو ''چیک'' جاری کرنے سے قبل ''سٹیتھی سکوپ'' ڈھونڈنا شروع کر دے۔ ممبر اسمبلی بن جائے تو اپوزیشن کی تواضع کرنے کے لئے ان پر بے ہوشی کی دوا چھڑک دے۔ وزیر بن جائے تو کار کے ساتھ ایمبولنس باندھ لے۔ وزیر داخلہ بن جائے تو پولیس کو بندوقوں کے ساتھ ساتھ انجکشن بھی جاری کر دے۔ وزیر صحت بن جائے تو فارما کمپنیوں کے ساتھ مک مکا کر لے۔ ان تمام دلدروں سے بچے رہنے کی واحد کنجی یہی ہے کہ اگر وہ ڈاکٹر ہے تو ڈاکٹر ہی بنا رہے اور فارما کمپنیوں کے نمائندوں سے پوچھ پوچھ کر دوائیں لکھتا رہے۔

کہتے ہیں کہ سوچ سمجھ کر کام کرنے والے دانشور زندگی میں 'سوری'' کا لفظ بہت کم استعمال کرتے ہیں لیکن طنز

نگارکوقدم قدم پرسوری کرنا پڑتا ہے کیونکہ بسا اوقات وہ جولکھ رہا ہوتا ہے اس سوچ میں سمجھ کا دخل نہیں ہوتا لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پڑھنے والا سوچ سمجھ کرسنجیدہ ہو جاتا ہے بس لکھاری معافیاں مانگتا پھرتا ہے۔ ہمارا کہیں بھی مقصد اس مقدس پیشے کوبدنام کرنا نہیں ۔لیکن اس میں گھسے ہوئے ایسے ڈاکٹروں کا احتساب کرنا ہے جنہوں نے اس پیشے کہ پہلےتو کاروبار بنایا تھا اوراب لاکھوں روپوں میں گردے، جگراور رلیلیے بدل رہے ہیں ۔لیکن بات کوسنجیدہ کرنے سے قبل ہم اصل موضوع پر واپس آنا چاہیں گے کہ ہمیں فکریہ دامن گیر ہے کہ مریض کا علاج تو ڈاکٹر کرے گامگر ایسے ڈاکٹروں کی خواہشات کا علاج کون کرے گا؟ ہوسکتا ہے ڈاکٹرنوازشریف، ڈاکٹر طاہرالقادری یا ڈاکٹر بابر اعوان کے پاس کوئی معقول جواب ہو؟

خبردار اگر دو نمبر کہا تو!

حفیظ سنٹر لاہور کے کوئی موبائل فون کے تاجر چین گئے اور دو ہزار موبائل فونز کا آرڈر دینے کے لئے مارکیٹ کا سروے کرنے لگ گئے۔ فرماتے ہیں کہ جب ایک چینی تاجر نے پانچ سو روپے فی موبائل طلب کئے تو وہ اتنا سستا موبائل دیکھ کر چکرا سے گئے۔ معلوم ہوا کہ کچھ عرصہ قبل تک وہ چینی تاجر صرف ایک نمبر کوالٹی کا موبائل بنایا کرتے تھے جس کی قیمت لگ بھگ پانچ ہزار پاکستانی روپے بنتی تھی۔ کسی پاکستانی تاجر نے قیمت کم کرنے کا کہا تو چینی نے انکار کر دیا۔ بالآخر ہمارے بھائی نے ان کو موبائل سستا کرنے کی ایک ترکیب بتائی وہ یہ کہ کیس اعلیٰ کوالٹی کا بنائیں اور اندر سارا سودا پست ترین معیار کا ڈال دیں جو کہ کم از کم ایک ماہ چلنے کے قابل رہے۔ اس طرح وہ سستا ترین موبائل بنوانے میں کامیاب ہو گئے۔ اب وہی چینی کمپنی چار قسم کے موبائل بنا رہی ہے جن کی قیمت پانچ سو، ایک ہزار، دو ہزار اور پانچ ہزار روپے فی موبائل ہے۔

ہم دوستوں کو یہ قصہ ابھی سنا ہی رہے تھے کہ ایک معروف کنسلٹنسی کمپنی کے بزنس ہیڈ جو کہ ہمارے پرانے شناسا بھی ہیں کا فون آیا کہ یار چترال میں بجلی بنانے کے ایک منصوبے کے لئے ہمیں فزیبلٹی رپورٹ کے ایک پارٹ کے طور پر ماحولیاتی رپورٹ درکار ہے آپ ایک ماہ کے اندر اندر دو لاکھ روپے کے عوض بنا دیں۔ ہم نے چینی موبائل فون والی حیرانگی سے دریافت کیا کہ اگر چترال کا دو ہفتے کا بھی دورہ رکھ لیا جائے تو بھی رپورٹ کم از کم تین ماہ لے گی اور صرف لاگت ہی محض دو لاکھ آ جائے گی تو وہ ہنس کر فرمانے لگے کہ ''فلاں فلاں کرنل صاحب نے بغیر چترال گئے محض ایک ماہ میں دو لاکھ روپے میں رپورٹ تیار کرنے کی حامی بھر لی ہے اور یار تمہیں تو پتہ ہے کہ کون بعد میں رپورٹیں پڑھتا ہے؟ بس اب یہ رپورٹ بنانے کی حامی بھر ہی لو''۔ ابھی ہم اس دوسرے صدمے سے نڈھال ہی پڑے تھے کہ ٹی وی میں خبر دیکھی کہ فلاں وزیر تعلیم کی ڈگری جعلی نکل آئی ہے اور اس طرح اب تک آدھے اراکین پارلیمنٹ کی ڈگریاں جعلی قرار دی جا چکی ہیں۔ ہم نے جلدی سے اپنی تمام ڈگریوں کو شک بھری نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا کہ مبادا ان میں سے کوئی جعلی نہ نکل آئے اور کہیں ہمیں بھی وزیر نہ بننا پڑ جائے۔

ہمارا جسم کمرے میں اور دماغ جعلسازی کی تاریخ کی فضاؤں میں غوطے کھا رہا تھا کہ اچانک کان دوستوں کی اس بحث کی طرف چلے گئے کہ جس میں دو بڑی سیاسی جماعتوں پر وہ اپنی پسند و ناپسند کا اظہار فرما رہے تھے ایک کے بارے میں یہ رائے ملی کہ یہ فلاں ادارے کی بنائی گئی پارٹی ہے اور ہمیشہ جعلی ووٹوں ہی سے برسراقتدار آتی ہے، دوسری کے بارے میں انکشاف ہوا کہ یہ ہے تو عوام کی پارٹی لیکن اس کے مالک خاندان کے سارے لیڈروں کو موت کے گھاٹ اتار کر اب حضرت داماد مالک کل ہیں اور موصوف نہایت دیانت داری سے اپنے دوستوں کو ارب پتی بنانے کے

مبارک منصوبے پر عمل پیرا ہیں لہذا اب یہ کوئی نظریاتی یا غریبوں کی پارٹی نہیں رہی بلکہ رس چوسنے والے کیڑوں پر مشتمل ارب پتیوں کی پارٹی بن چکی ہے۔

ہم نے دونمبری حقائق سے جان چھڑانے کے لئے جان بوجھ کراپنی توجہ اپنی نئی نئی کامیاب ہوتی جمہوریت کی طرف مبذول کر لی ہے۔جس نے ابھی ابھی تاریخ میں پہلی بار اپنے تسلسل کے پانچ برس مکمل کیے ہیں۔لیکن دارلخلافے کی شاہراہ جمہوریت پر جو کسی ماہر ڈرامہ نگار کا طویل دورانیے کا کھیل جاری ہے اس نے ہماری توجہ کو کئی حصوں میں بانٹ کرر کھ دیا ہے۔اب نہ تو ہمیں شریف شہنشاہوں کے اندر کی جمہوریت نظر آ رہی ہے اور نہ احتجاجی کپتانوں کے لہجوں کے پیچھے چھپے ذہنوں میں کوئی جمہوری رمق متاثر کر رہی ہے تمام سیاسی جماعتوں کے پول اور اسٹیبلشمنٹ کے رول کچھ ایسے ویسے کھل رہے ہیں کہ آنکھوں پر دوربین اور سوچوں پر خوردبین لگا کر بھی ایک نمبر ہونے کا احتمال نہیں ہو پا رہا یہ بھی یاد آ رہا ہے کہ پچھلی حکومت میں کسی بھی اتحادی نے ساتھ چھوڑنے کا کیوں نہ سوچا؟ کیونکہ ایسا کرنے کا مطلب شائد ریلوے وزیراعظم پی آئی اے کی وزارتیں نیز سندھ، پنجاب و پختونخواہ وغیرہ کی حکومتیں چھوڑنا پڑتی ہوں گی؟ ہوسکتا ہے کہ اس جیسے تمام واقعات زمانہ قدیم سے ہی ظہور پذیر ہوتے چلے آ رہے ہوں لیکن ہم نے اب محسوس کیے ہوں مگر اس پر مستزاد ہم یہ حماقت کر بیٹھے کہ اپنے پیدا کرنے والے رب کے واحد کلام میں سے ان تمام واقعات کو اس آیت سے جوڑ بیٹھے ہیں کہ جس میں فرمایا گیا ہے کہ "جیسی قوم ہوگی ویسے ہی حکمران"۔

اب کلام مجید نے ہمیں نئی الجھن میں ڈال دیا ہے کیا ہم سماجی طور پر دونمبر ہو چکے ہیں؟ اس خیال کا اظہار ہم غلطی سے کہیں کسی محفل میں کر بیٹھے بس پھر ہماری شامت آ گئی اور ایک برادر نے بھری محفل میں ہمیں خوب لتاڑا اور با آواز بلند ہماری طرف اشارہ کر کے یہ اعلان فرمایا کہ یہ خود بے ایمان ہوں گے،انہوں نے حرام کمایا ہوگا،قرضے معاف کرائے ہوں گے،اپنے جرائم چھپانے کی بجائے یہ ساری عوام کو بے ایمان اور بے حس کیوں کہہ رہے ہیں؟ ہم تو بے حد نیک اور شریف عوام ہیں وغیرہ وغیرہ۔موصوف کے سامنے پہاڑی نمار کابی میں بڑی بوٹیوں سے ٹپکتا شوربہ داڑھی کو نچ کر رہا تھا اور داڑھی پیٹ کو نیز پیٹ گھٹنوں کو۔ہم نے فوراً کھسک جانا مناسب جانا مبادا محفل میں ہمیں کافر قرار دے دیا جاتا تو کون گھونسے مکے کھاتا پھرتا؟

چند روز بعد ہمسائے میں کسی بزرگ خاتون کی فوتگی ہوگئی جنازے میں تو ہم شامل نہ ہو پائے اور یہ سوچ کے ہم قل میں چلے گئے کہ لوگ ہمیں کاٹھا انگریز ہی نہ سمجھ بیٹھیں ان کے حالیہ آباد ہونے والے "گھر داماد" سے وجہ انتقال دریافت کی تو معلوم ہوا کہ جب سے نازوں پلے بیٹے نے فون پر ماں کو اطلاع دی تھی کہ اماں میں نے اپنے سسرال کے قریب ایک گھر کرائے پر لے لیا ہے تاکہ بچوں کی نانی ہماری غیر موجودگی میں ان کی دیکھ بھال کر سکیں تو موصوفہ جگر کے ٹکڑے کی "سسرال بردگی" کا سن کر خلاؤں میں گھورتے گھورتے چند ماہ بعد ہی چل بسیں۔

اس طرح کے سماجی حملے ہم پر تقریباً روزانہ ہوتے ہیں اب ہمیں اس بات کی بالکل سمجھ نہیں آ رہی کہ ہم سب دونمبر ہو چکے ہیں یا ابھی کچھ کسر باقی ہے۔ہم نے گن گن کر تاریخ پاکستان و دیگر معاملات میں ایک نمبر لوگوں کو ڈھونڈنا شروع کر دیا ہے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے کہ ایک نمبر لوگ بھی جب پسند ناپسند پر اتر آتے ہیں تو پھر تاریخ بذات

خود دونمبر بن کر رہ جاتی ہے آج ایک مشہور زمانہ مدبر قرآن کی کتاب اٹھا کر جب ہم تاریخ اسلام کا جائزہ لینے لگے تو یہ پڑھ کر ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ قرآن وحدیث میں تحریف وغلط تشریح کا آغاز بھی کہیں خلفائے راشدین ہی کے ادوار میں مخالفین نے کر دیا تھا۔

اگر مفاد کی خاطر ہم پارٹیاں بدل لیں، ماں باپ بدل لیں، وفاداریاں بدل لیں تو پھر بھی کس کی کیا مجال کہ کردار کا حوالہ دے کر ہمیں بے ایمان کہہ دے۔ خبردار جو کسی نے ہمیں دونمبر کہا تو!

بکرا دوڑ

ہم نے جب پہلے پہل سنا تھا کہ عید الاضحیٰ پر جانوروں کی قربانی دراصل تقویٰ کی عظیم یاد کا تسلسل ہے کہ جس میں حضرات ابراہیمؑ نے اپنے بے حد عزیز بیٹے کی گردن پر چھری چلا دی تھی تو یقین کریں کہ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور آج کے دم تک تقویٰ کی یہ انتہا اور گہرائی اپنی سمجھ سے بالاتر ہی رہی ہے۔ نبی آخرالزمان ﷺ نے تو اپنی امت کی آسانی کی خاطر ہمیں اپنی عزیز ترین چیزوں کے متبادل کے طور پر دنبے وغیرہ کی قربانی کا حکم فرما کر ہماری مشکل تو آسان کر دی ہے مگر ہم ہیں کہ اب ہمیں نہ تو یہ یاد رہا ہے کہ قربانی کا اصل سبق تقویٰ اور عزیز از جان کی قربانی ہے اور نہ ہم یہ یاد رکھنا چاہ رہے ہیں کہ دنبہ ایک سمبل یا علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے نہ کہ اڑوس پڑوس اور رشتہ داروں سے مقابلہ کرنے کے لئے مہنگے سے مہنگے جانور کے مظاہرے کے طور پر۔ موجودہ مقابلہ بازی و دکھلاوے بازی کو دیکھ کر ہمیں سردار جی کا ایک واقعہ یاد آ گیا ہے کہ وہ بچے کے ہاتھ میں چاقو دیکھ اس کو پکڑنے کے لئے جب اس کے پیچھے بھاگے تو بچہ ڈر کر بھاگا۔ اس کی رفتار کہیں باپو جی سے زیادہ تھی۔ بس سردار جی یہ بھول بھال کر کہ اس وقت مقصد بچے کو پکڑنا ہے اتنا تیز بھاگے کہ اس سے بھی آگے نکل گئے اور پھر پیچھے مڑ کر بچے سے کہنے لگے کہ ''ہورلا کے وکھ دوڑاں''۔ یقیناً بچہ بھی ہکا بکا رہ گیا ہو گا کہ یہ باپو جی کو کیا سوجھا؟ اب ہم بھی اصل مقصد بھول کر قربانی کو محض ناک کا مسئلہ بنا بیٹھے ہیں اور سالانہ ایک ارب روپے سے زائد کے بہترین جانور صرف عید الاضحیٰ پر مقابلے کی نذر کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم نے ثواب کما لیا۔

آج ہمیں یہ تو یاد نہیں رہا کہ ہم نے تقویٰ بڑھانا ہے اور اللہ سے محبت کے ثبوت کے طور پر اپنے نفس پر چھری پھیرنی ہے اور نہ ہی یہ یاد رہا ہے کہ جس رقم سے جانور خرید کر قربانی کرنے جا رہے ہیں وہ کیسے کمائی؟ اس رقم کو کمانے میں جھوٹ کا کتنا سہارا لیا؟ شرک کر کے مال تو نہیں بنایا؟ ملکی قوانین و اخلاقیات و دین کے دیگر تقاضوں کو پورا کیا یا الٹا دکھلاوا اور مقابلہ حسن جانوراں پر لگ گئے ہیں؟ یہ سمجھے بغیر کہ ملک میں گوشت والے جانوروں کی اس وقت حالت کیا ہے اور صرف عید کی ضرورت پوری کرنے کے لیے پچھلی بار آسٹریلیا سے ہزاروں بھیڑیں منگوائی گئیں لیکن بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ کسی خطرناک بیماری میں مبتلا تھیں اور ان کو زندہ تلف کر دیا گیا۔

ملک میں گوشت پیدا کرنے والی بہترین نسلیں رو بہ زوال ہیں جس کی اہم وجوہات حکومتوں کی ناقص منصوبہ بندی، قدرتی آفات مثلاً سیلاب و زلزلے اور ان سب پر مستزاد ہماری ضرورت سے زائد گوشت خوری کی عادت۔ ابھی تو ملک میں غربت کی وجہ سے یہ ہمہ گیر مسئلہ خاصی حد تک نظر اندازی کی بانہوں میں ہے یہ پنڈورا بکس تب کھلے گا جب محض دس فیصد عوام ہی کبھی خط غربت سے اوپر آ گئی اور ایک سے دو وقت کھانا کھانے کے قابل ہو گئی۔ ہم نے سوچا ہے کہ اس سلسلے میں عوام میں آگاہی کی مہم ہی چلا لیں۔ شائد اسی طریقے سے کچھ لوگ عقل کا سراغ پا جائیں اور ملک و قوم

ترقی کی طرف گامزن ہو جائے۔

چشم تصور سے ہم نے دیکھا ہے کہ ہم ریڈیو، ٹی وی اور مختلف عوامی اجتماعات میں لوگوں کا شعور جگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔لوگوں کے سوئے ہوئے آسودہ خیالات میں ہلچل کی سی کیفیت ہے اور یک دم سے ملک عزیز پاکستان میں تین دھڑے بن گئے ہیں۔ایک دھڑا وہ کہ جس نے قربانی کے بعد کھالیں اکٹھا کرنا تھیں۔ان کو ہمارے نظریات پھیلنے کے نتیجے میں اپنا کاروبار مندا ہوتا نظر آ رہا ہے۔لہذا انہوں نے پہلے ہی ہلے میں ہمیں کافر قرار دے دیا ہے دوسرے مرحلے میں یہی دھڑا عوام کے مذہبی خیالات کو بھڑکا کر رمشہ کیس کی طرح سے سر عام قتل کی منصوبہ بندی بھی کر رہے ہیں۔لیکن کوشش کر رہے ہیں کہ ساری واردات پر مذہبی رنگ غالب رہے تا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔اس کے بعد دوسرا دھڑا جو وجود میں آیا ہے وہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے لاکھوں روپے صرف اس لئے جانور خریدنے پر صرف کر دیئے ہیں تا کہ اولاً تو شریکوں پر رعب پڑے اور دوم ان حضرات سے پچھلے سال بھر میں رقم کمانے میں اگر کوئی اخلاقی ،قانونی یا مذہبی ناجائز حرکات ہوئی ہیں تو اپنے تئیں وہ اس سے پاک صاف ہو جائیں اس دھڑے کی یہ بھی از حد کوشش ہے کہ نہ صرف ہماری بات عوام تک نہ پہنچے بلکہ ہماری کسی دیگر کوتاہی و گناہ کو اتنا بڑھا کر لوگوں کو بتایا جائے کہ ہماری کسی بھی بات سے ان کا شعور نہ جاگے۔

یکدم ہماری نظر تیسرے دھڑے پر پڑتی ہے تو ہم خود بھی دم بخود رہ جاتے ہیں یہ عوام کا وہ طبقہ ہے کہ جن کا شعور ہمارے دلائل سے کہیں جاگ گیا ہے اور وہ بکرے، چھترے یا بیل و اونٹ کی طرف بھاگنے کی بجائے اپنی سب سے زیادہ پیاری اشیاء کو اکٹھا کرنے کے لئے بھاگ رہے ہیں تا کہ ان کی قربانی دے کر وہ دینی تقاضوں کے مطابق ثواب دارین حاصل کر لیں۔

ہم ساہوتو سامنے آئے

کبھی جب عام سے نام رکھنے کا رواج تھا تو ایک ہی گاؤں یا ایک ہی خاندان میں درجنوں عبدالعزیز، محمد بشیرا ،احمد دین ،نیز سکینہ ،عذرا اور عابدہ ہوا کرتے تھے ۔پھر شہر کے لوگوں نے اپنی گاؤں زدہ زندگی چھپانے کی غرض سے کروٹ لی اور اپنے بچوں کو ہمایوں ،عمران ،شاہ رخ نیز رباب ،ماریہ اور نمرہ سے بدل ڈالا پھر میڈیا نے کروٹ لی۔دنیا گاؤں بننے لگ گئی تو دوسری زبانوں کے ناموں کا رواج پانے لگ گیا اور اکثریت یونیک ناموں کے پیچھے بھاگنے لگی پھر یہی لوگ قمطار،مسطین ،التان ،اور ناشی ،توشہ ،عروہ وغیرہ بن گئے۔

انفرادیت کی اس دوڑ نے البتہ ایک اچھا کام کر ڈالا ہے اب حمل ٹھہرتے ہی نوجوان نسل نے قرآن کھولنا شروع کر دیا ہے پڑھنے ،سمجھنے یا عمل کے لیے نہیں ،بلکہ آنے والے بچے کا نام ڈھونڈنے کیلیے اور ساتھ ہی ساتھ نو ماہ دعاؤں میں گزارنے شروع کر دیے ہیں کہ یا خدا جو یونیک نام ہم نے سوچ رکھا ہے دور دور تک لوگ اس کے اثر سے محفوظ رہیں ۔تاکہ ہمارا آئندہ پیدا ہونے والا بچہ شکل وصورت میں چاہے عام لوگوں سے بھی گیا گزرا ہو ،مگر کم سے کم نام کے حوالے سے اتنا منفرد ہو کہ ہر کوئی نام پوچھ کر حیران ہو اور معنی سن کر پریشان ہی رہ جائے ۔اور پھر ہم ان پڑھ ہو کر بھی دوسروں پر اپنے علم کا رعب جمائیں فخر سے دوسروں کو چڑائیں اور کہیں کہ ''ہم ساہوتو سامنے آئے''۔

ناموں کی اس دوڑ نے سکول کے اساتذہ کا اتنا خانہ خراب نہیں کیا جتنا رپورٹیں لکھنے کے لیے پولیس کا ہاضمہ خراب کیا ہے۔اب ایف آئی آر میں کچھ اس طرح کے نام سامنے آرہے ہیں عدیم قمطار ولد بوٹا مسیح ،چمنیس افنان ولد اللہ ڈوایا ،یا ناشی توشہ دختر محمد رمضان ،عدالت کے دروازے سے اکثر سائل کو دی گئی آواز سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہر کارہ آدو بکا کر رہا ہے یا پھر پیٹ درد کے علاج کے لیے زور زور سے مدد کے لیے پکار رہا ہے۔

نام رکھنے کے اصل ذمہ دار والدین ہیں لیکن اگر والد صاحب خود ارد گرد لوگوں کو منرل واٹر پیتے اور کے ایف سی کے برگر کھاتے دیکھیں نیز شارٹس پہنے رنگ برنگی گاڑیوں پر گھومتے پھرتے دیکھیں تو ان کو بھی اپنا معیار زندگی بلند کرنے کا خیال آجاتا ہے ۔اور پھر وہ بھی نیکر کے نیچے چپل پہن کر 70 سی سی بائیک پر اے ایف سی کی لائن میں لگے جعلی منرل واٹر کی بوتل کے گرد بازو حمائل کیے جب کاؤنٹر پر لڑکی نما لڑکے سے ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں اردو کا تڑکہ لگا کر انگریزی بولنے لگ جاتے ہیں اس وقت تو یقین کریں کہ ہمارے تن بدن میں ٹھنڈک سی پڑ جاتی ہے اور ہمارا دل قوم کو اس ترقی پر بھرپور مبارکباد دینے کے لیے مچلنے لگ جاتا ہے۔

ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں فلم اور ڈرامہ نگاروں کو جو بڑی محنت سے خوبصورت لڑکے لڑکیوں کے کچھ ایسے منفرد نام رکھتے ہیں کہ اگر موصوف خود سامنے نہ ہوں اور محض ذکر ہی چل رہا ہو تو یقین کریں پتہ نہیں چلتا کہ گرمیوں کے

لون کے سوٹوں کا ذکر ہو رہا ہے یا عبرانی زبان میں آہ و بکاہ ہو رہی ہے لڑکی کے نام پہ لڑکے کا شبہ اور لڑکے کے نام پر لڑکی کا اس پر مستزاد ان کی اداکاری بھی مخنثوں جیسی۔ اس مبارکباد کے بعد شاباش ان فارغ والدین کو جو آسانی کی خاطر ہر سال پیدا ہونے والے بچوں کے نام انہی فلموں ڈراموں سے نقل کر لیتے ہیں اور بچہ بھلے سے ساری دنیا کو عدل کی خاطر محض ایک آنکھ ہی سے دیکھنے کے قابل ہو، نام بھی ویسا ہی یونیک جیسی کہ آنکھیں۔

دیار غیر میں بسنے والے ہمارے ہم وطن جب اپنی زبان میں کسی بچے کا نام رکھتے ہیں تو الف بے کے فرق سے بعض اوقات وہاں کی لوکل زبان میں اس کے کچھ اور ہی معنی نکل آتے ہیں۔ مثلاً کسی کے نام کا عربی میں مطلب اگر پھول بنتا ہو تو عین ممکن ہے کہ وہاں کی لوکل زبان میں اس کا مطلب ڈھول بنتا ہو۔ ہمارے جاننے والی ایک بچی جب تک سکول جاتی رہی ڈپریشن کا شکار رہی کیونکہ اول تو کسی کو اس کے نام کی سمجھ نہیں آتی تھی پھر لوگ ہجے پوچھنے بیٹھ جاتے تھے اور پھر معنی۔ وہ بتاتی ہے کہ "انکل یہاں تک تو قابل برداشت ہوتا تھا مگر جب کچھ لوگ کھی کھی کر کے ہنستے تھے تو غصہ آجاتا تھا"۔ ایک روز سکول سے خوش خوش واپس آ کر جب اس نے بتایا کہ ہمارے سکول میں ایک "لڑکا" بھی اسی نام کا موجود ہے تو ہم نے اس کی ماں کے چہرے پر مایوسی کی پرچھائیں دیکھی جیسے کہ اس کے رکھے گئے یونیک نام کی افادیت کھوگئی ہو۔

ہم نے پچاس برس بعد کے پاکستان کو چشم تصور میں دیکھا ہے کہ ساری نسل کے نام انتہائی محنت سے خاصے یونیک ہو گئے ہیں۔ اب وزیراعظم "نجر شادمانی" ہیں اور صدر "چمکوک خان" ہیں۔ وزیر خارجہ "عبدالمسجف" اور وزیر داخلہ "پکانکف وین" ہیں۔ دھرنے والوں کے نام بھی نام دھرنے والوں کی طرح کے ہو گئے ہیں۔ مثلاً بریکن نیوز آرہی ہیں کہ اسلام آباد کے سرخ علاقے میں "جدولی چیتھم" کے داخل ہونے پر پولیس نے لاٹھی چارج کر دیا۔ اور دوسری جانب ڈی چوک سے آنے والے "چنوری کینڈک" کے علاوہ "شیخ جھونکا" کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ پارلیمنٹ کے سپیکر "ڈیاز راوک" نے پی ٹی آئی کے اراکین اسمبلی "ہیبت خان، شہنشاہ نواب اور پریتم بخش" کی رکنیت معطل کر دی ہے۔ جبکہ حکومتی وزیروں جناب "کوکش سلمانی، نیرش جہاں اور پرکیشم راؤ" نے اپوزیشن کے خلاف دھواں دار تقریریں کیں۔ اور ان پر جوابی حملے محترمہ "ٹنی ٹی بوشل" اور جناب "جاکروچ خاکانی" نے کیے۔ اب اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں وزیر دفاع "خوجہ باسف" خطاب کریں گے نیز بریکنگ نیوز کے آخر میں یہ کہا جائے گا کہ اب کیمرہ وومین "سیرتی رملوک" کو جی پی ٹی وی سے اجازت دیجیے۔

ریڈیو سے فرمائش بھی کچھ یوں نشر ہوگی کہ سامعین یہ نغمہ آپ سب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ لاہور سے "دہاج اور دجاج"، راولپنڈی سے "آیان، عروہ اور سانجھ"، چنیوٹ سے "حافر، ارمیم، ساریک اور چومومو"۔ سامعین کراچی سے ہمارے سننے والے تھے "نمام، چورک، بانول اور سلیلی" اب اجازت دیجیے۔ اللہ حافظ

ہمارے پاس بھی ملالہ ہے

ہمیں شرف ملاقات بخشنے ہمارے ہم زلف جب نیو یارک تشریف لائے تو حق مہمانی ادا کرنے کی خاطر ہم انہیں رابرٹ گیر وکی فلم دکھانے ٹائم سکوائر کے اس سینما میں لے گئے جہاں کے ارد گرد ہی یہ فلم فلمائی گئی تھی۔ واپسی پر انہوں نے بڑے درویشانہ انداز میں کہا کہ" لاہور لاہور اے۔ بھلا کہاں یہ بیچارہ رابرٹ گیر و اور کہاں ہمارا سلطان راہی۔ بلکہ بھارتی اداکار امریش پوری وغیرہ"۔ ہم نے اپنی مہمان نوازی کا مذاق اڑتے دیکھ کر کئی ایک ہالی وڈ سٹارز کی بلاک بسٹر فلموں کا ذکر کیا لیکن وہ اپنی محفل کے ستاروں مثلاً محمد علی، منور ظریف اور ریما بلکہ سلمان، شاہ رخ، مادھوری اور کترینہ وغیرہ کے گن گاتے رہے۔ خیر ہم بات گول کر گئے کیونکہ فارغ لوگوں کی بحث قومی تصادم سے فٹافٹ ذاتی تصادم پر اتر آتی ہے۔ بس چپ چاپ ان کے ساتھ مکڈونلڈ کی لائن میں لگ گئے۔

بدقسمتی سے ہماری محفلوں میں بس فلمی ستارے ہی رہ گئے ہیں وگرنہ امریکیوں کے پاس جارج واشنگٹن سے لیکر بل گیٹس تک ایک لمبی لائن ہے۔ اور ان کے گن گاتے وہ تھکتے بھی نہیں۔ مغرب کے پاس بھی لارڈ میکالے، جنرل ڈیگال، برٹرینڈ رسل، ڈاونچی اور کارل مارکس جیسے سینکڑوں ستارے سجے ہیں اور تو اور افریقہ نے نیلسن منڈیلا، بھارت نے رابندر ناتھ ٹیگور اور گاندھی، انڈونیشیاء نے سوئیکارنو، ملائشیا نے مہاتیر محمد، چین نے چی گویرا اور ماوزے تنگ، کوریا نے کم ال سنگ، برما نے مادام سوچی، بنگلہ دیش نے قاضی نذر الاسلام بلکہ ہم نے بھی محمد علی جناح اور علامہ اقبال جیسے ستارے اپنی محفل میں سجا رکھے ہیں۔ لیکن شاید ہی دنیا کی کسی قوم نے درسی کتب و میڈیا سے اپنے قومی ستارے خارج کر کے فلمی ستارے سجائے ہوں گے سوائے زندہ دلان پاکستان کے۔ اب ہماری نئی نسل حضرت عمرو علی، سرسید، مجدد الف ثانی نیز جناح و اقبال کے بارے میں پوچھے گئے سوالات سن کر یوں پلکیں جھپکاتی ہے جیسے تیز روشنی میں الو۔ لیکن شاہ رخ، کترینہ و آفریدی کا سن کے یوں مسکراتی ہے جیسے مور ناچتا ہے اور پھر ان کے تمام ریکارڈ سنانے کی ٹیپ چل پڑتی ہے۔

1966ء میں امرتسر ٹی وی اسٹیشن کے افتتاح کے موقع پر مونیکا گاندھی اور 1982ء میں ایک انٹرویو میں سونیا گاندھی نے دعوی کیا تھا کہ پاکستان کے ساتھ اب ہماری روایتی جنگوں کا زمانہ نہیں رہا ہمارے میڈیا کی بدولت اب پاکستان کی آئندہ نسلیں ہماری ہی ہوں گی۔ بات درست ثابت ہوئی ہے۔ ہمارے سیاستدان تو ان کے تھے ہی اب ہماری حکومتیں بنانے میں بھی ان کا ہاتھ نظر آنے لگ گیا ہے۔ اب تو ان سب باتوں میں مضائقہ بھی کوئی خاص نہیں رہا ہے۔ کیونکہ جب چاند ہاتھ نہ آئے تو ستارے ہی سہی، ستارے دور لگیں تو فلمی ستارے ہی سہی، ترکش میں تیر نہ رہیں تو ڈنڈے سوٹے ہی سہی، اصلی علم نہ رہے تو جعلی ڈگری ہی سہی، اصل بال نہ اگ پائیں تو ٹرانسپلانٹیشن ہی سہی، سائنسدان ملک سے بھاگ جائیں تو سیاستدان ہی سہی، بینظیر نہ ملے تو زرداری ہی سہی، مادام کیوری نہ جنم لے پائے تو ملالہ ہی

سہی، اور اگر نواز سے حکومت نہ چھین پائیں تو فی الوقت پرانے پاکستان کا نام ہی ''نیا پاکستان'' سہی۔

غیر تو خیر ہوتے ہی شائد سازش کرنے کے لیے ہیں۔ ہم اپنے گھر کے چراغ کو کیا کہیں؟ اگر 1974ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے تعلیم کو حکومتی تحویل میں لے کر عملاً ریزہ ریزہ نہ کر دیا ہوتا تو شاید آج ہم بھی جناح و اقبال کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر قدیر خان کو بھی یاد رکھتے۔ آغا حسن عابدی اور عبدالستار ایدھی کے ساتھ ساتھ قبل از سیاست والے عمران خان کو بھی نصاب کا حصہ بناتے، فاطمہ جناح، عابدہ طوسی اور میری این شمل کا کتابوں میں ذکر کرتے۔ اسی طرح شائد ملک عزیز میں حقیقی تعلیم، تربیت اور تحقیق زندہ رہتی تو پاکستان کے اولین نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالاسلام پر مذہبی تفریق لگانے کی بجائے انہیں اپنا قومی ہیرو قرار دے کر فخر کرتے نیز اپنے ہی ملک پاکستان میں داخلے پر قتل کی دھمکی دینے کی بجائے ان کو کرسی فاخرہ پیش کرتے۔

اب جو دختر پاکستان ملالہ یوسفزئی کو دوسرا پاکستانی وقار نوبل انعام کی شکل میں ملا ہے اس کو بھی اگر اسی بھٹو فیم اور ضیاء فیم تعلیمی نظام کے زاویے سے دیکھیں تو ہمیں اس کا حشر بھی ڈاکٹر عبدالاسلام جیسا ہوتا نظر آ رہا ہے۔ وہ طبقہ ابھی مرا نہیں جو مذہب کی دوکانداری کرتا ہے وہ اس بچی پر بھی یہودی سازش کی مہر ثبت کرے گا اور اسے ماہر مغربی نشانچی کا کارنامہ قرار دے گا جس نے انتہائی مہارت سے ملالہ پر اس انداز سے گولی چلائی تھی کہ یہ بچی مر کے کہیں پاکستان کو دوسرے نوبل انعام اور مستقبل کی وزیر اعظم سے محروم نہ کر دے۔ ہمیں ایسا ہوتا اس لیے نظر آ رہا ہے کہ ہم نے 1974ء میں پاکستانی تعلیمی نظام کو مردہ کرنے کی دانستہ حکومتی کاوش سے قبل میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ اس لیے ہم ابھی تک تمام معاملات کو پہلے پہل انسانیت کے حوالے ہی سے دیکھنے کے عادی ہو چلے ہیں۔ اور بڑی بعد میں کہیں اس کو مذہبی رنگ میں رنگتے ہیں۔ اور وہ صرف اتنی کہ ہم انسان کو دین کا حصہ اور مخاطب سمجھتے ہیں۔ بس ہمیں یقین ہے کہ موجودہ مردہ تعلیمی نظام کی پیداوار اس سے آگے شائد سوچ بھی نہ سکے کہ ملالہ کبھی بھی اپنے ہی ملک میں نہ گھس پائے۔

چونکہ مایوسی کفر ہے اس لیے ہمارے پاس ایک عدد ''فوڈ فار تھاٹ'' ہے یا یوں کہہ لیں کہ ایک مفت کا مشورہ ہے۔ ہم بحیثیت پاکستانی فیصلہ کر لیں کہ ہم نے دنیا کو اپنا کونسا چہرہ دکھانا ہے تہذیب یافتہ یا دہشتگر دانہ؟ اگر ہم ایک اچھے بھلے ''انسان'' پر مذہبی پینٹ کر کے اسے ملاں بنا سکتے ہیں تو کیا ایک اچھے بھلے ''ملاں'' پر پینٹ کر کے اسے ''پاکستانیت'' والا ''انسان'' نہیں بنا سکتے؟ اس زاویے سے ملالہ پاکستان کا اثاثہ بھی بن سکتی ہے مبادہ ہم اس پر بھی اپنے ہی ملک میں قدم دھرنے پر پابندی نہ لگا دیں۔ فیصلہ اب ہم نے کرنا ہے۔ یا تو کہنا ہے ''اے مغرب سلالہ کی طرح ملالہ بھی تمہاری''۔ یا پھر فخر سے کہنا ہے کہ ''اوئے لالہ ہمارے پاس بھی ہے ملالہ''۔ خواب اور حقیقت زرافے کی طرح ہے۔ خواب میں اگر زرافے کی گردن چھوٹی کر کے اس کا سر نزدیک لانے کی کوشش کی گئی تو نہ زرافہ رہے گا اور نہ اس کا سر۔ لیکن اگر حقیقت کو تسلیم کرنے کی عادت ڈال لی گئی تو یقین کریں زرافہ بھی خوبصورت نظر آئے گا اور ملالہ بھی عزت کا نشان بن جائے گی۔ اگے تہاڈی مرضی۔

سپر کاکا

ہمارے اکثر گھریلو اور بیرونی اقدامات کو بیگم ہدف تنقید بناتی رہتی ہیں مگر ہم بھی اپنے وضاحتی بیانات کے کمال سے اپنی کھال بچانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ خصوصاً جب ہم بیگم سے درخواست کرتے ہیں کہ جانم سمجھا کرو کہ آجکل حالات کیسے ہیں اور ہمارا فلاں قدم کیوں ضروری تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہماری بیگم سے مشورے کی عادت نے ہمیں اپنے حلقۂ احباب میں کافی حد تک تنقید کی وجہ بنا رکھا ہے۔ ایک بار ملک غیر سے درآمد شدہ ہمارے ایک کنسلٹنٹ نے کچھ یوں تبصرہ کیا کہ ''بیگم سے مشورہ کرنا کچھ اس طرح سے ہے جیسے ٹھنڈی چائے پینا، یا اردو میں لطیفے سنانا یا انگریزی میں غزل پڑھنا یا پھر سخت گرمی میں پان کھانے جانا اور وہ بھی دور تک پیدل چل کر جبکہ دکان پر پہنچ کر پتہ چلے کہ آج وہ بند ہے''۔

ہم ساری تنقید برداشت کر لیتے ہیں لیکن بیگم سے ہر بات پر مشورہ ضرور لیتے ہیں۔ دراصل جو ہم جانتے ہیں وہ دوسرے نہیں جانتے۔ یعنی ہمارے اکثر اقدامات کا نتیجہ غلط نکلتا ہے بس ناکامی کی آدھی ذمہ داری بیگم پر۔ گو کہ امر واقعہ یہ ہے کہ ہم بیگم سے صرف اس معاملے پر خصوصی مشورہ لیتے ہیں جس کا انہیں علم اور تجربہ نہیں ہوتا۔ بس سانپ بھی مر جاتا ہے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی۔ البیرونی نے اپنی کتاب الہند میں موجودہ پاکستانی سرزمین پر بسنے والوں کا ماضی میں دوسرے معاشروں سے مقابلہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہاں کے مرد اپنی بیوی کی رائے ہر اہم معاملے پر لیتے ہیں۔ جبکہ ترک، ایرانی و افغانی ایسا نہیں کرتے۔ ہم نے یہ مقولہ جب سے اپنے دوستوں کو سنایا ہے تب سے وہ میری عقل پر ماتم کرنے کے ساتھ ساتھ البیرونی کو بھی لپیٹے میں لینے لگ گئے ہیں۔

آجکل سیاسی گہما گہمی کا ماحول ہے۔ ہم کئی روز سے بیگم کی رائے لینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کیا ہمیں تحریک انصاف میں شامل ہو جانا چاہئے؟ اب ظاہر ہے بیگم کی معلومات صرف اخباروں یا فیس بک کی حد تک ہے جہاں عمران چھائے ہوئے ہیں۔ جب فرمایا کہ عمران بہترین کپتان تھا تو ہم نے لقمہ دیا کہ بھئی پاکستان کی سیاست کوئی بچوں کا کھیل یعنی کرکٹ تھوڑی ہے۔ جس پر انہوں نے پینترا بدلا کہ دیکھو شوکت خانم جیسے عظیم ہسپتال بنانے والا پاکستان کے ادارے بھی تو بنا سکتا ہوگا۔ ہم نے اس پر طرہ لگایا کہ ہسپتال تو گنگا رام اور گلاب دیوی نے بھی بنائے تھے تو کیا وہ سیاست میں کود گئے تھے؟ اس پر بیگم نے خالصتاً زنانہ مثال دے کر ہمیں مات دینے کی کوشش کر ڈالی کہ دیکھو اس نے یہودی بیوی سے چھٹکارہ بھی تو پا لیا ہے۔ ہم نے آگاہ کیا کہ وہ یہودی لابی کی طرف گئے ہی کیوں تھے؟ جس پر زچ ہو کر انہوں نے بالی وڈ طرز کا جواب دیا کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں۔ ہم ہندو کلچر کی اس توجیح پر یہ سوچ کر چپ رہے کہ اگر آسمان پر بننے والی چیز بیچ چوراہے آ پھوٹے تو کہاں گیا آسمان؟ مزید اس لئے بھی چپ رہے کہ ہم خود تحریک انصاف جوائن کرنا نہیں چاہ رہے تھے۔ بس اگر بحث نہ سمیٹتے تو شمولیت اختیار کرنا پڑتی۔

سیاست کے بازار کی موجودہ گرما گرمی سے اندازہ ہو رہا ہے کہ شائد ایمپائر نے انگلی خفیہ طور پر کھڑی کر دی ہے۔ کیونکہ اس انگلی کو نہ تو کیمرہ دیکھ پایا ہے اور نہ تماشائی۔ یہ انگلی یا تو شیخ رشید کو نظر آ رہی ہے یا پھر عمران اور قادری کو۔ البتہ زرداری کی آنیوں جانیوں سے بھی لگتا ہے ایمپائر نے واقعی انگلی کھڑی کر دی ہے۔ اور اس کی نشانی یہ ہے کہ اس نے ''سپر کاکے'' کو آگے کر دیا ہے۔ ابھی ہم یہ بات کر ہی رہے تھے کہ ہماری اکلوتی بیوی جو بڑے انہماک سے ٹی وی پر راگ بھیروی سن رہی تھیں، کو اچانک اشتہار میں کہیں سپر کاکا نظر آ گیا۔ وہ چونک کر بولیں ''سنیے عمران، نواز، قادری، مشرف کے علاوہ پیپلز پارٹی بھی تو ہے۔ آپ اس میں شامل کیوں نہیں ہو جاتے؟ ہم نے کانوں کو ہاتھ لگا کر ان کو منطق سمجھائی کہ زرداری کا بیٹا بھٹو کے روپ میں سپر کاکا بن کر اب مزید کئی برس اس قوم کو بیوقوف بنانے کے ساتھ ساتھ کیا ہمارے بڑھاپے کو بھی برباد کر دے؟ نیز ہم نے سیاست میں جتنے بھی تماشے دیکھے ہیں ان میں سپر کاکے کا تماشہ سب سے انوکھا ہے۔ کیونکہ یہ اپنے نام کے ساتھ دو باپوں کا نام لگاتا ہے اور اس چیز کو کبھی گالی سمجھا جاتا تھا۔ موصوفہ نے ناک بھوں چڑھا کر اپنا رخ روشن دوبارہ ٹی وی کی طرف کر لیا اور ہم جان کی امان پا گئے۔ ہم اس'' مورتوں والے ڈبے'' کے بیحد مداح ہیں کہ اس کی بدولت محترمہ چند ساعتیں خاموش رہتی ہیں۔

ہم تو اس سوچ میں گم ہیں کہ ہمارا کسی نہ کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہونا کیا بہت ضروری ہے؟ ہم میں تو چند لاکھ لگا کر سستا تندور تک چلانے کی سکت، جرأت اور مہارت موجود نہیں۔ ہم بھلا سیاست کو کاروبار کے طور پر کیسے چلائیں گے؟ ہم نہ تو سرمایہ دار ہیں کہ نواز لیگ ہمیں قبول کر لے۔ نہ جاگیردار کہ پیپلز پارٹی ہمیں خوش آمدید کہے۔ نہ دین اسلام کو مناسب انداز میں بیچنے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں، اس لیے چوالیس عدد مذہبی جماعتوں سے بھی پکی چھٹی۔ کیونکہ ہم درمیانے طبقے میں بڑی ہمت کر کے چمٹے ہوئے ہیں کہ مبادہ ذرا سی غفلت سے کہیں غربت کی اتھاہ گہرائیوں میں نہ گر پڑیں۔ اس حوالے سے ہو سکتا تھا کہ ایم کیو ایم ہمارے لیے مناسب رہتی۔ لیکن مادری زبان اردو نہ ہونے کے سبب ہم وہاں بوری بند کیے جا سکتے ہیں۔ عمران کی پارٹی اس لیے مناسب نہیں کہ آجکل ان کے دونوں کانوں میں ٹلیاں ہی کھسر پسر کرتی رہتی ہیں۔ مشرف کے بارے میں سنا تھا کہ انہیں اپنے علاوہ بھی کچھ لوگوں کی ضرورت ہے۔ اور اگر ملک ان کی قیادت میں آ گیا تو یہ امید بندھ جائے گی کہ اٹھاون ٹو بی کے آگے بھی بند بندھ جائے گا۔ اب وہ ہمارے اوپر رقم خرچ کرنے سے تو رہے۔ ہم کونسا شوبز سے تعلق رکھتے ہیں؟

ہمارے جیسا ''مڈلکچول'' جو روزانہ اپنے بٹوے سے خرچ شدہ چند روپے گننے میں کئی گھنٹے لگا دیتا ہے اسے بھلا کونسی پارٹی قبول کرے گی؟ ہمیں تو شائد پارٹی رکنیت لینے کے لیے بھی بیگم سے روپے ادھار لینا پڑیں۔ اور اس پر مستزاد الیکشن لڑنے کی رقم اور پھر ووٹ خریدنے کے لیے سرمایہ؟ بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا۔

گلو کے ماموں

جس طرح امیر اقوام میں عوام صحت منداور لیڈرز کمزور واقع ہوتا ہے۔ اس کے الٹ غریب اقوام کے لیڈر خاصے تنومند ہوتے ہیں۔ جبکہ عوام کی تصویر جب اخبار میں چھپتی ہے تو بچے سمجھتے ہیں کہ دادا جان کا ایکسرے چھپ گیا ہے۔ امریکہ کی پچپن فیصد آبادی خوشحالی کے باعث موٹاپے کا شکار ہے۔ جبکہ دیگر ترقی یافتہ مما لک میں بھی اناج کے دشمن پینتیس فیصد سے کم نہیں ہیں۔ لیکن وہاں کی تمام حکومتی مشینری بمعہ سیاسی لیڈروں کے، سمارٹ سوٹوں کے اندر ہی سما جاتے ہیں۔ جبکہ ہمارے تنومند لیڈر اور اسٹیبلشمنٹ دو چار کنٹینرز یا دو چار سو کنال کے محلات میں بھی بمشکل سما پاتے ہیں۔ گلی کوچوں میں ہماری عوام کو جب کوئی جاسوس طیارہ فضا سے دیکھتا ہے تو مچھر سمجھ کر دو چار ڈرون داغ دیتا ہے اور عوام یوں بھنبھناتے ہوئے عاجزی سے مر جاتے ہیں جیسے اگر غلطی سے زندہ رہ گئے تو خفیہ اہلکار اس جرم میں انہیں غائب نہ کر دیں۔ جب مغرب کو ضرورت پڑتی ہے کہ وہ اپنے ''نمائندے'' یا با الفاظ دیگر غریب مما لک کے لیڈر کو سبق سکھانا ضروری سمجھے تو پھر اس پر ایک عدد گولی ضائع کرنے کی بجائے اس کے دو چار سو مچھر نا نپ کار کن مار دیتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے تربیت یافتہ تنومند لیڈر کو ''کان'' بھی ہو جاتے ہیں کہ سرتابی کی سزا ہے کتے کی موت۔ لہٰذا وہ زیادہ تندہی سے اپنے ذمے لگے ''فرائض'' سرانجام دینے لگ جاتا ہے۔

یہ جاننے کے لئے کہ غریب عوام کے لیڈر کس طرح صحت مند رہتے ہیں ہمیں کئی ایک کی جاسوسی کرنی پڑی۔ عقدہ کھلا کہ بھتے کی رقم سے وہ سب سے پہلے لندن وغیرہ سے اپنے میڈیکل ٹیسٹ کرواتے ہیں۔ تاکہ بہترین بیرونی علاج کے سہارے وہ بدترین عوامی منصوبے سرانجام دے سکیں۔ ازاں بعد عمرہ کرنے چلے جاتے ہیں جہاں ان کو تازہ ترین ''احکامات'' سے نوازا جاتا ہے۔ پھر انہیں دنیا بھر کی سہولتیں بہم پہنچا کر نگرانی کا شکنجہ کس کر عوام کے سمندر یعنی مچھروں کی بستی میں پھینک کر تماشہ دیکھا جاتا ہے۔ بے خبری کے باعث جب عوام جوق در جوق اس کے ارد گرد دلڈیاں ڈالنے لگ جاتے ہیں اور تقسیم در تقسیم دھڑوں میں حسب مشابہت (برائے مہربانی اسے مشابہت نہ پڑھا جائے) جاتے ہیں تو مغرب میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

کئی دفعہ ایسا تنومند لیڈر عوام میں جب گھر جاتا ہے تو اخبار میں دونوں سٹیک ہولڈرز کی تصویر دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے کشمیری سیب کے ارد گرد جراثیم منڈلا رہے ہیں۔ ہمارے دل جلے انکل بدروح نے لیڈر کی سائیڈ لیتے ہوئے ہمیں یوں ہدف تنقید بنایا ہے کہ آپ نے پروانوں کی محبت کی توہین کی ہے۔ خیر انکل کیا جانیں کہ پروانے شمع کا بوسہ لینے کی کوشش میں مر مٹیں یا اس نا ہنجار شمع کو سرے سے بجھا دینے میں ہی اپنی جان کھو بیٹھیں، ہر دو صورتوں میں نقصان خربوزوں کا ہے، چھری سلامت ہی رہتی ہے۔ لیڈر اور بیرونی آقا دونوں سلامت رہتے ہیں۔ ویسے تو عوام بھی مرتی

رہتی ہے لیکن لیڈر کے مرنے کی سپیڈ خاصی سست ہے۔شائد یہی وجہ ہے کہ توازن برقرار رکھنے کے لیے بسا اوقات ''وعدے'' سے مکر جانے والے لیڈر پر دو چار گولیاں ضائع بھی کرنی پڑ سکتی ہیں۔

ماضی کے ہمارے ایک ہر دلعزیز لیڈر ان زمانوں میں بھی پیرس کا منرل واٹر پیتے تھے جب پیرس کی عوام ابھی تازہ تازہ ہی ٹونٹی کا پانی پینے کے قابل ہوئے تھے اور تب ان کے اپنے جاں نثاروں کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے اور ان کے لیڈر کے خون کا گروپ ایک جیسا ہے۔ہمارے ہمسایہ غریب ملک کا ایک لیڈر صرف ان بکریوں کا دودھ پیتا تھا جن کو صبح شام ڈرائی فروٹ کھلائے جاتے تھے۔ہمارے ہی ایک اور جینئس قوم پرست لیڈر خاصہ عرصہ لندن گزار کر جب اپنی ہی قوم کے لوگوں میں واپس آئے تو اپنے ہاتھ پر رومال باندھ کر جاں نثاروں سے ہاتھ ملایا کہ مبادا سستے اور گھٹیا جراثیم ان کے خوبصورت بلوچ جسم کو نہ چاٹ جائیں۔احتیاطاً ایک لحاظ سے درست تھی کہ پڑوس کے دشمنوں سے تنخواہ لے کر ان جیسا دوسرا ''فرض شناس'' کہاں سے ڈھونڈا جاتا؟ اسی زمانے کی بات ہے کہ لاہور کی ایک سڑک پر کچھ بے روزگار بھوکوں نے کسی عورت کا پرس چھین لیا تا کہ چند دن تک تو پیٹ بھر کر کھانا کھا سکیں۔مگر ایک درویش پانچ ستاروں والے حاکم لیڈر نے ان کو ننگا کروا کے اسی چوک میں کوڑے لگوائے۔گو کہ لٹنے والی عورت پھر بھی اپنے پرس سے محروم رہی اور چوروں کا بھی سب کھایا پیا باہر آ گیا لیکن انصاف کے اس بول بالے نے خاصے عرصہ تک چوروں اچکوں کے ساتھ ساتھ عوام کو بھی چپ سادھے رکھنے پر مجبور رکھا۔

مچھر عوام کا خون چوستا ہے لیکن جو مچھر کا بھی خون چوس جائے اسے انکم ٹیکس آفیسر نہیں بلکہ کسی سیاسی جماعت کا باکمال لیڈر سمجھا جاتا ہے۔یہ چوسا گیا خون اگر جگر میں ہوگا تو وہ دھڑلے سے برسوں جیل میں رہنے کے باوجود امیر ممالک میں محلات کھڑے کر سکے گا۔اور اگر آنکھ میں ہوگا تو وہ عوام پر ڈھائے گئے مہنگائی کے مظالم پر خون ٹپکانے کی بجائے جلدی سے اپنا سرمایہ باہر لے جائے گا۔خون چونکہ عوام کا ہے اس لیے اصلی ہے۔وگرنہ اگر مصنوعی ہی چاہیے ہو تو ہسپتالوں کے باہر منڈلاتے جہازوں سے چند روپوں میں مل سکتا ہے۔جس کو بآسانی جگر، آنکھ یا دل سے ٹپکایا جا سکتا ہے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ ایک اور لیڈر جب اپنے ائر کنڈیشنڈ احتجاجی کنٹینر سے باہر آئے تو ان کو بھی مجبوراً بھنبھناتے کارکنوں کے جراثیموں سے بچنے کے لیے ٹشو پیپر رکھ کر ہاتھ ملانا پڑا۔وہ زمانے لد گئے جب عوام کا پسینہ بہتا تھا تو لیڈر کا لہو۔اب تو لیڈر اپنا پسینہ پونچھ کر ٹشو پیپر خون پسینہ ایک کرنے والے کارکنوں کی طرف پھینک دیتے ہیں تو ''مومنین'' اس کو تبرک سمجھ کر چومنے یا ہو سکتا ہے چوسنے ہی لگ جاتے ہوں۔اب بھی باعلم و باکمال لیڈر کا دبدبہ اتنا ہے کہ بے ہنر و بے سمجھ مریدان سے یہ بھی پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ حضرت آپ کس ملک کے باشندے ہیں؟ کس کے کہنے پر ہمیں ڈھائی ماہ تک شناختی کارڈوں اور ٹی اے ڈی اے کے زور پر سڑکوں پر بٹھائے رکھا؟ اور اب کس کے اشارے پر ہمیں یہ گیت سنا رہے ہیں ''ہم چھوڑ چلے ہیں محفل کو۔۔یاد آئیں کبھی تو مت رونا''

اور قدر دانوں اب سنیے آج کا تازہ لطیفہ۔گلو بٹ صاحب نے سر عام ایک استعفیٰ ''لینے'' والے لیڈر کو ماموں کا لقب دے مارا ہے۔یہ شائد اس کا بھولپن ہے یا اس کی سیاسی پارٹی کی لائن ہے کہ جس نے پہلے پہل گاڑیاں توڑ کر

عوام کی توجہ حاصل کی تھی اب اس نے ''ہیوی مکینیکل کمپلیکس'' کے بنے ہوئے عظیم ''تھنک ٹینک'' کو ماموں کہہ کر پھر توجہ حاصل کرلی ہے۔ بیچارے کو شائد معلوم نہیں کہ لاہوری اس لفظ کا کیا مطلب لیتے ہیں۔ کبھی ایک سیاسی جماعت کو فوجی جنتا کے سہارے جب اقتدار پر چڑھائی والی بیساکھی ملی تو محض اس ماموں والے طعنے سے منہ چھپانے کے لیے اقتدار چھوڑ کر چلتے بنے۔ اب معلوم نہیں شاہی مسجد کے عقب والے ماموں مودے کا کیا حال ہو رہا ہوگا؟ یہ بھی ممکن ہے کہ سب لقب یافتہ ماموں اپنی اپنی پوزیشنوں سے استعفےٰ دینے کا فیصلہ کرلیں۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر مخالفین کو ہمارا مشورہ ہوگا کہ وزیر اعظم کو بھی فی الفور ماموں کا لقب دے چھوڑیں۔ شائد ایسے ہی دشمنوں کی مراد بھر آئے۔

آم کے آم، گٹھلیوں کے دام

قدرت نے دنیا بھر میں بے شمار نسلوں کے جاندار تخلیق کر رکھے ہیں۔ ان میں سے خوبصورت ترین شاہکار انسان ہے۔ ویسے تو وسیع تر تناظر میں اس کا شمار بھی جانوروں میں ہوتا ہے۔ لیکن بسا اوقات یہ خود بھی اپنی چند ایک منفی عادات کے سبب حیوان کے درجے پر اتر آتا ہے۔ عادتوں کی بنا پر نسل انسانی میں کئی گروہ رہے ہوں گے مگر آج ہم ایک ''وکھری ٹائپ'' کے درویش جانور کا ذکر کرنا چاہ رہے ہیں جو آتا تو انسانوں کی کیٹگری میں ہے لیکن اس نے اپنے ''پیٹ کی فریاد'' کے سامنے ہتھیار ڈال کر مختلف علمی، ادبی، سیاسی و سماجی تقریبات میں ایک مدبر و سکالر کا روپ دھار کر مسلسل شرکت فرما کر جس ثابت قدمی سے ''بوٹیوں کی پہاڑیاں'' فتح کی ہیں اس نے ہمیں اتنا متاثر کیا ہے کہ ہم نے اپنی کل متاع یعنی یہ کالم آج اس کی نذر کر دیا ہے۔

لگ بھگ تین دہائیوں سے ''دانشورانہ لیکچر'' جھاڑتے ہوئے ہماری توجہ کبھی اس ''روٹی بوٹی'' گروہ کی جانب اتنی نہ گئی تھی جتنی اگلے روز پی سی ہوٹل کی ایک بیوروکریٹک ''نشستن، گفتن، برخاستن'' جیسے سیمینار والے دن گئی جب لنچ سے قبل اٹھتے ہوئے دو درویشوں نے ہمیں باقاعدہ طور پر یاد دلایا کہ لنچ کے بغیر سیمینار سے اٹھ جانا ایک عظیم حماقت ہے اور قریباً آدھے تھال کو ایک پلیٹ میں قید کرنے کی کامیابی حاصل کرنے کے بعد تقریب میں موجود دیگر دانشوروں سے واقفیت بنائے بغیر رخصتی ''مزید حماقت'' تصور کی جائے گی۔ خیر اگلے ہی روز ایک ویسی ہی تقریب میں سابقہ سیمینار میں موجود ایک تیسرے درویش دانت خلال کرتے ہوئے ہمارے قریب آئے اور شکوہ کن سے انداز میں فرمایا کہ سر آپ نے کل پی سی کا لنچ کیوں چھوڑا؟ ان پے در پے ''سرزنشوں'' سے ہماری چشم تصور میں وہ تمام ''علم کے بھوکے'' گھوم گئے جن کے چہرے ہمیں اپنے تمام لیکچرز میں تسلسل کے ساتھ نظر آتے رہتے تھے۔ ہمیں یاد آیا کہ خصوصی طور پر ان کا کورم اس تقریب میں پورا نظر آتا تھا جس کے طعام کی ذمہ داری کسی بڑی کمپنی نے اٹھا رکھی ہوتی تھی۔ اس تصور ہی سے ہماری انا کو ٹھیس پہنچی اور ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ہیں کیونکہ ہم تو ان درویشوں کی لیکچرز میں دلچسپی کو علم کی بھوک ہی سے تعبیر کرتے رہے تھے۔

ہمیں اپنی خوش گمانی پر خاصہ تعجب ہوا کہ آج سے قبل یہ مبارک چہرے پہچانے کیوں نہ گئے؟ اب دھیرے دھیرے یہ عقدہ کھل رہا تھا کہ یہ سب درویش، چہرے پر علم کی مگر پیٹ میں حلیم کی بھوک سجائے سٹیج کی قربت کی بجائے ارد گرد سجنے والے کھانوں کے قرب والی کرسیوں پر ہی کیوں براجمان ہوتے تھے؟ بلکہ اپنی ''مزید حماقتوں'' پر بھی رہ رہ کے قلق ہوتا رہا کہ ہم تو ''دانشوری'' کے زعم میں اس حد تک عالم استغناء کی منزلوں تک جا پہنچے جہاں بیشمار ''فری لنچز'' سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہ تو سراسر ''پیٹ کے علمی تقاضوں'' سے روگردانی ٹھہری۔ ایک اور ظلم ہمارے ساتھ یہ ہوا ہے کہ اب مختلف

محفلوں میں ہم ان ''حقیقی دانشوروں'' کو دزدیدہ نظروں سے دیکھنے لگ گئے ہیں اور ہماری توجہ اب سٹیج سے بکھرتے علم کے موتیوں کو سمیٹنے کی بجائے ان درویشوں کی لکتی توندوں سے گڑگڑاہٹ کی آوازوں پر مرتکز رہنے لگ گئی ہے۔ اور تو اور، اب تو یہ لگنے لگ گیا ہے کہ یہ آٹھ دس درویش ہی درحقیقت اصل دانشور ہیں اور محفل میں یہ سب کو چھوڑ چھاڑ کے صرف ہمیں ہی تضحیکی نظروں سے گھور رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے ہماری باڈی لینگوئج پڑھ لی ہو اور اب اپنے پہچانے جانے کے ڈر سے ہمارے خلاف کوئی حربی تدبیر بھی سوچ رکھی ہو یعنی کہ جونہی ہم نے کبھی ان کے ''پیٹو معاملات'' پر انگلی اٹھائی تو پھر عین ممکن ہے کہ ہم تو اپنے منہ کی کھائیں گے اور یہ موصوف درویش صاحبان ادھر ادھر کی ہر شے چٹ کر جائیں گے۔

آج چونکہ ہمیں اس درویش گروہ کے اندر چھپی خداداد ''شکمی صلاحیتوں'' کا ادراک ہو رہا ہے تو اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ احساس بھی ہو رہا کہ یہی دراصل ذہین لوگ ''آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام'' والے کامیاب مدبرین ہیں اور ایک تیر سے کئی شکار کامیابی سے کھیل سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب وہ ''حصول علم کے لالچ'' میں کسی فری لنچ یا فری ڈنر پر تشریف لے جاتے ہیں تو ذرا اندازہ لگائیں کہ کس قدر دیگر فوائد بھی سمیٹ لیتے ہیں۔ علم کی چلم بھی حاصل کر لی اور ساتھ ہی ساتھ گھر میں اپنے اوپر اٹھنے والے کھانوں کے اخراجات بھی بچا لیے۔ گھر سے باہر رہ کر اپنی فیملی کو اپنے منحوس ڈکاروں سے بھی بچالیا اور اس کے ساتھ ساتھ دفتر وغیرہ سے ذرا جلدی چھٹی لے کر اپنے آپ کو اس کام سے بھی بچالیا کہ جس کو ''جوان کی موت'' سمجھا جاتا ہے۔ ہم نے ان شکمی جنگجوؤں کو ایک اور کام بھی کرتے دیکھا ہے۔ وہ اپنے شکمی مشن کے دوران ہی دو چار تگڑی آسامیوں کو بھی تاڑ رکھتے ہیں۔ اور اپنا اصل ہدف پورا کر کے یعنی کھانا کھا کر ان آسامیوں کی قربت میں چلے جاتے ہیں۔ اور ان کے بزنس کارڈ لے کر بعد میں وقتاً فوقتاً اپنے دفتری فون سے مفت کی کالیں کر کے ان سے رابطہ بھی رکھتے ہیں۔ یہی آسامیاں پھر ان کے لیے مزید منافع کا باعث اس طرح بنتی ہیں کہ جب یہ درویش ان کو انشورنس وغیرہ کے لیے پھانس لیتے ہیں یا پھر اپنی سیلز مین شپ کے جادو سے ان کی جیبوں کا شکار بھی کر لیتے ہیں۔ شائد انہی کے لیے حکیم الامت نے فرمایا تھا کہ:

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارا، نہ ملا ہے، نہ زاہد، نہ حکیم

اب تو قارئین کو بھی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ آخر میڈیکل کانفرنسز وغیرہ میں اس قدر رش کیوں ہوتا ہے۔ اور صبح کے وقت کانفرنس ہال خالی لیکن لنچ کے قریب کیونکر ہاؤس فل ہو جاتا ہے۔ یہ بھی عقدہ کھل گیا ہوگا کہ مسجد میں نمازی کیوں کم کم رہتے ہیں۔ جنازے کے ساتھ قبرستان تک جانے والے محض انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جبکہ مرحوم کے گھر میں موجود عزیز و اقارب ایک دوسرے کو کیوں امید بھری نظروں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے بھی تو یہی بات کی تھی کہ

ہمیں معلوم ہے مرنے کے بعد کیا ہوگا
احباب کھائیں گے چاول، فاتحہ ہوگا

نیز ولیمے کے موقع پر عین کھانے کے وقت سیدھے ہال میں آتے مہمانوں کا تانتا بندھا ہوتا ہے لیکن محض آدھا گھنٹہ قبل دلہا کے ابا سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ شائد معاشرے میں ان کا سوشل بائیکاٹ نہ ہو گیا ہو۔ گھروں کے اندر دعوتوں کا بھی یہی حال ہے سگے بہن بھائی بھی صرف کھانا کھانے کے لیے مزید دیر کر کے گھر میں گھستے ہیں اور بھوجن کرتے ہی منہ پھاڑ پھاڑ کر جماہیاں لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج دفتر میں بہت کام تھا نیز ان کی بیگم بھی فرما رہی ہوتی ہیں کہ ''بہن دو دن سے سوئیں سکی کھانا بہت مزے کا تھا اب اجازت چاہتے ہیں''۔

سیاسی جماعتوں کے استقبالیے بھی ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ اگر پارٹی سربراہ کو آنے میں دیر ہو جائے تو کارکن حسب جثہ کیک و بریانی وغیرہ کو فتح کرنے کے لیے ''برادر کارکنوں'' کے کھنے سینک دیتے ہیں اور دیکھنے والوں کو صوفی تبسم کی ''ایک تھا تیتر ایک بٹیر۔۔۔ لڑنے میں تھے دونوں شیر'' والی نظم یاد آ جاتی ہے۔

ہمارے معاشرے نے کافی وقتوں سے معدے سے سوچنا شروع کیا ہوا ہے۔ مگر شومئی قسمت سے معدے ہیں خراب۔ دماغ کو خاصہ سنبھال کے رکھ چھوڑا ہے مبادا کڑے وقتوں میں ضرورت نہ پڑ جائے لیکن ہوتا یوں ہے کہ جیسے طاق پر قرینے سے سجائی اور سنبھالی گئی کتاب اللہ اب صرف قسمیں اٹھانے کے لیے رہ گئی ہے ویسے ہی مشکل وقتوں کے لیے سنبھالا گیا دماغ بھی اب پلیٹیں اٹھانے اور فیس بک کا سٹیٹس اپڈیٹ کرنے کے لیے ہی رہ گیا ہے۔ اب ہم اتنا سارا عقل و دانش سے دور نکل آئے ہیں کہ لگتا ہے کہ ایک وہی رستہ بچا ہے جس پر عمل ہمارے علم اور حلم کے بھوکے درویش بھائی کر رہے ہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

اُنش پی آئی اے

اپنے ایک دیرینہ مہربان کے منہ سے لفظ "اُنش پی آئی اے" سن کر ہم مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ دراصل وہ اگلے روز گلگت بذریعہ جہاز جانے کی خبر ہمیں دیتے ہوئے یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ اگر پی آئی اے کو منظور ہوا تو ہم کل گلگت میں ہوں گے۔ تمام کائنات کا ایک ہی رب ہے اور "انشاءاللہ" کا تعریفی لفظ اسی کے لیے مخصوص ہے لیکن اسی اللہ کی زمین پر جو بے شمار مصنوعی خدا اگ آئے ہیں ان پر شاید اس سے بہترین طنز نہیں ہوسکتا تھا جو ہمارے دوست نے اُنش پی آئی اے کہہ کر کچوکہ مار کے کر دیا ہے۔ اس سے ہماری چشم تصور ایک بار پھر کھل گئی ہے اور ہماری یادداشت پر بیشمار مصنوعی اور عارضی خداؤں کی فہرست اتر آئی ہے ہم سب خداؤں کے ساتھ اُنش لگا کر خود ہی محظوظ ہورہے تھے۔ آج ہم نے سوچا ہے کہ اگر آپ کو بھی ہم اپنی چشم تصور کے باغات کی سیر کرادیں تو کوئی خاص مضائقہ نہ ہوگا۔

انشاءاللہ اس بار بھی اُنش امریکہ اور اُنش آرمی پاکستان میں جمہوریت کو مزید طوالت ملنے کی امید ہے لیکن چونکہ جمہوریت کی طوالت سے اپوزیشن کی سیاسی جماعتیں خود لرزہ براندام رہتی ہیں کہ اُنش تقدیر لوگوں کی اکثریت خدانخواستہ شعور نہ پکڑ لے اور بے صبر سیاسی جماعتوں کی ناکام قلابازیوں یا پھر "کامیاب دھرنوں" کے سکرپٹ رائٹرز تک ہی نہ پہنچ جائیں۔ حکومت البتہ مزے سے ڈٹی رہی ہے کیونکہ اُنش نواز، اُنش دشمناں اور اُنش مہنگائی عوام کبھی بھی پیٹ کے چکر سے نہ نکل پائے گی۔ لہذا کہاں کا شعور اور کہاں کی جمہوریت؟

اُنش مہنگائی اس سال بھی بکرے دگنی قیمت پر دستیاب ہے۔ اب تو یہی بہتر ہوگا کہ عوام پورے جانور کی قربانی کرنے کی بجائے خالی دستی اور پٹھ وغیرہ کی قربانی یا پھر مرغی اور بٹیر وغیرہ کی قربانی کرنا شروع کردیں۔ اس عید قربان پر بھی اُنش زوجہ ہمیں بولنے کا موقع نہیں ملا وگرنہ ہم گائے کی اجتماعی قربانی میں حصہ ڈال کر رقم کو اقساط میں ادا کردیتے اور بکروں پر کی گئی سرمایہ کاری کی رقم سے گاڑی وغیرہ ہی خرید لیتے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُنش پولیس اگر ہماری گاڑی چوری ہوگئی تو اُنش کار مافیا ہم کچھ مزید رقم ڈاکوؤں کی نذر کرکے دوبارہ برآمد کروا لیتے۔ چونکہ شامت اعمال زوجہ محترمہ بہت سارے بکروں کی ضد پہ اڑی رہیں اس لیے ہم اُنش سسرال اگلے دس برس ابھی سکوٹر کو ہی دھکا لگاتے رہنے کا پروگرام بنارہے ہیں۔

اُنش یہودیت جناب قادری صاحب ریڈ زون کی تعفن زدہ بند گلیوں میں بھٹکنے کی بجائے اُنش عرب چند ارب لے کر کینیڈا کی خوشبودار ٹھنڈی اور کھلی فضاؤں میں ڈکارتے پھر رہے ہیں۔ اُنش آرمی اب کپتان بھائی بھی کچھ ایسا ہی کرنے جارہے ہیں۔ لیکن اُنش خدا اس باران سے ذرا سی غلطی ہوگئی ہے اور وہ اس بندے کا استعفیٰ مانگ بیٹھے ہیں جو اُنش امریکہ لگ بھگ چودہ برس کی اقتدار سے جدائی برداشت کرنے کے بعد ابھی تازہ تازہ ہی اُنش بھارت وزیراعظم

بنے ہیں۔اب اگر انش عقل عمران خان اپنی موجودہ ضد سے ذرا کم درجے کے مطالبے پر مک مکا کر لینے پر تیار ہوں تو کئی عرب ان کے لیے بھی کئی ارب لے کر ہاتھ باندھے حاضری کی درخواست کر سکتے ہیں۔لیکن مذکورہ دونوں ''احتجاجی رہنماؤں'' کے لیے خوشی کی نوید یہ ہے کہ انہوں نے کمال ہوشیاری سے اپنا ہدف جو''سسٹم'' کی بجائے ''نواز شریف'' سے بدل لیا ہے۔اس سے انش آرمی جناب نواز شریف بھی اب بادشاہت سے نیچے اتر کر ڈپٹی کمشنر کے لیول پر آ گئے ہیں۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انش عمران قادری کسی حد تک ان کے مطالبات مانے جا چکے ہیں۔اب بھی اگر خان صاحب''میں نہ مانوں''والی پالیسی پر اڑے رہے تو پھر آخری حربے کے طور پر ان کا دماغ انش سعودیہ دو چار عمروں کے اندر اندر ٹھیک کرالیا جائے گا۔

اگر انش طالبان مولانا فضل الرحمان نے عمران خان کے گناہ معاف کر دیئے تو پھر یقین سے کہا جائے گا کہ پاکستان کی سیاست میں بڑا ہر یک تھرو ہو گیا ہے۔کیونکہ انش افغانستان ایسا ہونا ابھی مشکل نظر آ رہا ہے۔ویسے انش فضل الرحمان کے پی کے کی حکومت گر نہیں پائی جس کا انہیں غالبا ڈیزل کا لائسنس نہ ملنے سے بھی زیادہ قلق ہوا ہو گا۔ہمارا مشورہ ہے کہ وہ انش طالبان مرکزی حکومت ہی سے جڑے رہیں۔جلد ہی ان کو نئی ہدایات جاری کر دی جائیں گی۔انش ق سے قادری صاحب نے ق ہی سے ق لیگ کی توقعات پر جو پانی پھیرا ہے اس سے ق لیگ بیچاری تو اخباروں ہی سے نکلتی جا رہی ہے۔اور اب وہ بیچارے پلے سے رقم لگا کر اخباروں کے پہلے صفحے پر دوبارہ سے آنے کا سوچ رہے ہیں۔ق برادران پر ایک اور مشکل نریندر مودی کی طرف سے آن پڑی ہے اور وہ یہ کہ انش مودی کئی برس تک نواز شریف کو بھارت کی جانب سے کوئی خاص ٹف ٹائم نہیں ملنے والا۔

انش الفریڈ نوبل فاؤنڈیشن ملالہ کو ڈبل نوبل پرائز کا سر پرائز مل چکا ہے لیکن انش اسلام ہمارے میڈیا کو اس سلسلے میں سانپ سونگھ گیا ہے اور یوں لگتا ہے کہ اگر میڈیا نے انش مافیا ملالہ کو پروجیکشن دے ڈالی تو کہیں میڈیا پر ڈرون حملہ ہی نہ ہو جائے۔کراچی سے بھی دو بری خبریں آئی ہیں یعنی انش ڈاکو مافیا جناب عبدالستار ایدھی صاحب دفتر میں بیٹھے بیٹھے ہی لٹ چکے ہیں لیکن حقیقت میں لٹے وہ لوگ ہیں جنہوں نے کروڑوں روپے ان کو صدقہ کرنے کی بجائے ان ہی کے پاس بطور امانت چھپا چھوڑے تھے۔وہیں پر انش الطاف بھائی ایم کیو ایم حکومت سندھ سے ایک بار پھر دکھاوے کے طور پر علیحدہ ہو گئی ہے لیکن اندرون خانہ ان کی حالت وہ ہو رہی ہے جو بلی کی چھیچھڑوں سے الگ ہو کر ہوتی ہے۔اوپر سے ایک اور خطرہ بھی ان کو لاحق ہو گیا ہے یعنی انکی طویل ترین گورنری کے ریکارڈ کو بھی نظر کھا جانے والی ہے۔اس لیے اب گمان غالب ہے کہ انش ہوس دولت وہ جلد ہی اپنے حصے وصول کرنے سیاسی سسرال کو معاف کرنے والے ہیں۔

اتفاق میں چونکہ برکت ہوتی ہے اس لیے انش اتفاق سے ہماری کرکٹ ٹیم آسٹریلیا کے خلاف ٹیسٹ میچ سیریز جیت گئی ہے اس جیت سے سب کو یہی سمجھ آئی ہے کہ ہمارا کرکٹ بورڈ سب کام سفارش ہی سے کرتا ہے اور وہ ہمیشہ سے ٹیسٹ فارمیٹ والی سفارشی ٹیم ہی کو ون ڈے اور ٹی ٹونٹی کے طور پر کھلاتا رہا۔اور اگر انش قسمت سے ہمارا یہ تجزیہ غلط نکل آئے تو پھر اس کے معانی یہی نکلتے ہیں کہ آسٹریلین ٹیم پر کسی نے ہرانے کے لیے کالا جادو کر رکھا ہو گا وگرنہ کہاں یہ منہ اور کہاں مسور کی دال۔اسی مہینے شائد نیوزی لینڈ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نہ کر دے اس لیے کرکٹ بورڈ کو چاہیے

کہ دو چار کالے جادوگر اور ایک دو دعا گو بھی بورڈ میں بھرتی کر لے مبادہ انشا عادت ہماری کرکٹ ٹیم پھر سے لڈو پر بنی سانپ سیڑھی والی گیم کے سبب سانپ کے منہ کا انتخاب نہ کر لے۔

انشا موسم اس بار بجلی کی لوڈ شیڈنگ ذرا کم ہوئی ہی تھی کہ حکومت نے یہ نوید دی ہے کہ اس بار گیس کی لوڈ شیڈنگ معمول سے زیادہ ہوگی۔ سبحان اللہ۔ انشا ہوس مال وزر پچھلی حکومتوں نے جان بوجھ کر زراعت، صنعت اور گھریلو ضروریات کو نظر انداز کر کے ملک کی قیمتی اور نہایت محدود دولت یعنی قدرتی گیس کو گاڑیوں میں جلانے کے جو اجازت نامے جاری کیے تھے اس کو موجودہ حکومت نے بھی جوں کا توں جاری رکھ کر عوام کو یہ پیغام دیا ہے کہ انشا اصول سرمایہ داری و جاگیرداری، حکومت اور عوام دو مخالف سیاروں کی مخلوقات ہیں اور ان دونوں کا واحد تعلق صرف الیکشن کے دنوں تک محدود رہے گا۔

پیتے ہیں لہو دیتے ہیں درس مساوات

آج ہمارا موڈ ہو رہا ہے کہ ذرا فلاسفرِ مشرق علامہ صاحب کے اُن افکار پر تنقیدی نظر ڈالیں جس میں انہوں نے افرنگ کے بارے میں یوں کہا ہے کہ وہ کمزور اقوام کا لہو پی کر دوسروں کو مساوات کی تعلیم دیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ایسا ہرگز نہیں ہے کیونکہ افرنگ نے تو لہو پینے میں ہمیشہ مساوات اور عدل ہی کو مقدم رکھا ہے۔ اگر مثال یوں لی جائے کہ جس طرح جسم کے لئے لہو ضروری ہے ایسے ہی قوموں کی ترقی کے لئے تیل ضروری ہے تو افرنگ جونہی کمزور اقوام کا لہو یعنی تیل پینے کا عمل شروع کرتے ہیں تو آخر دم تک آپس میں ہمیشہ انصاف کے ساتھ برابر تیل بانٹ لیتے ہیں ایک بار انہیں پتہ چل جائے کہ تیل کس ملک کے پاس ہے تو پھر ''اتفاق میں برکت ہے'' کے مصداق سب افرنگ متحد ہو جاتے ہیں لگڑ بگڑ کی طرح۔ اور جیسے یہ جانور شیر کی ہڈیاں تک چبا جاتا ہے اسی طرح عراق ہو یا لیبیا پورے کا پورا لہو انتہائی مساوات کے ساتھ آپس میں تقسیم کر کے پی جاتے ہیں بلکہ بعد میں ہڈیاں بھی مساواتی عمل کے ذریعے چبا جاتے ہیں اس لیے ان پر یہ الزام جچتا نہیں کہ وہ صرف دوسروں کو ہی مساوات کا درس دیتے ہیں۔

لہو پینے کے اس عمل کے پیچھے دراصل سارا ہاتھ مچھر کا ہے کہ جس سے ان دہشت گرد اقوام نے یہ گر سیکھا ہے۔ مچھر کو زندہ رہنے کے لئے لہو چاہئے ہوتا ہے چاہے وہ کالے کا ہو یا گورے کا اسی طرح افرنگ کو صرف قدرتی دولت چاہئے چاہے وہ وینزویلا کے پاس ہو، ایران، سعودی عرب و کویت کے پاس ہو یا مستقبل میں بلوچستان کے پاس۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمارا اصل دشمن تو مچھر ہی ٹھہرا جس نے گوروں کو یہ ترکیب سکھا رکھی ہے۔ یہ تبھی جانتے ہیں کہ ہم وزیرِ اعلیٰ جناب شہباز شریف کی قیادت میں ایک مچھر دشمن قوم واقع ہوئے ہیں بس مچھر نے آخر ہم سے کبھی نہ کبھی تو بدلہ لینا ہی ہے آجکل تو وہ ڈینگی کی شکل میں لے رہا ہے۔ نجانے کب ہماری معدنی دولت تک بھی جا پہنچتا ہے؟ اللہ خیر کرے۔ ہمیں بھلا اس سے کیا لینا دینا؟ ہم تو آج پھر دھرنے میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں۔

علامہ مرحوم کو چاہئے تھا کہ انصاف و مساوات پسند قوموں کے خلاف شعر بندی کرنے کی بجائے اصل ٹریز یعنی مچھر پر ہی طبع آزمائی فرماتے رہتے اس طرح ہماری افرنگ سے دشمنی مزید گہری نہ ہوتی لیکن ہمیں ابھی لقمان حکیم نے خبر دی ہے کہ علامہ صاحب نے مچھر کے بارے میں بھی لکھا تھا۔ لیکن انہوں نے مچھر کی مدح سرائی کی تھی کہ اس نے نمرود جیسے بد دماغ بادشاہ کی ناک میں دم کر دیا تھا۔ خیر اس نسخہ کیمیا کا بانی بھلے سے مچھر ہی ہو مگر جس نے بھی اس نسخہ پر عمل کیا ہے دھن دولت میں اس کی بلے بلے ہوگئی ہے۔ ذرا اندرون ملک نظر دوڑائیے۔ بھلے سے قومی سطح پر ہم نے شاید کسی کا لہو نہ پیا ہو۔ لیکن الحمدللہ ہماری عوام و قائدین نے تو طرح طرح کی مخلوقات کا خون پینے کی پریکٹس کی ہوئی ہے۔ بلکہ ہمیں تو لگتا ہے کہ ہمارے قائدین نے بھی افرنگ کی طرز پر عدل و انصاف کے ساتھ آپس میں مک مکا کر کے تبھی

اداروں اور کارخانوں کا خون پی لیا ہے۔ ہمیں اس وقت کچھ قریب کی مثالیں یاد آرہی ہیں مثال کے طور پر مچھر نے عوام کا خون چوسا ہے تو محترم شہباز شریف نے ڈینگی مچھر کا خون پی لیا ہے، بے نظیر نے اپنے والد کے ساتھیوں کا خون پیا تھا تو زرداری نے بینظیر کا خون پی کر بدلا چکا دیا۔ بگٹی نے دشمن بلوچوں کا خون کیا تو مشرف نے بگٹی کا خون جا چکھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے تعلیم وصنعت کا خون کیا تو ضیاالحق اس کا خون پی گئے۔ ضیاء نے اسلام کا خون بیچا تو "محافظ اسلام" امریکہ نے اس کا خون کردیا۔ مشرف نے مجاہدین کشمیر کا خون کیا تو ق لیگ نے مشرف کا خون اپنے ذمے لے لیا۔ فضل الرحمان نے طالبان کا خون پیا تو عمران خان اس کا خون کر گئے۔ ایم کیو ایم نے جماعت اسلامی اور پی پی کا خون پیا تو اے این پی اور سنی تحریک نے روزانہ کی بنیاد پر دس بارہ خون کرنے شروع کر دیے۔ پختونوں نے تحریک پاکستان میں باچہ خان کے ارمانوں کا خون کیا تو اسفندیار نے کالا باغ ڈیم کا خون پی لیا۔ مزدور اگر اپنا خون پیتے تھے تو سرمایہ داروں نے بھی ان کی مشقت کم کرنے کے لیے ان کا بچا کھچا خون پی لیا۔ اسی طرز پر جاگیرداروں نے مزارعوں اور ہاریوں کا خون پیا ہے۔ اور ہم نے یہ سب کچھ دیکھ کر صرف اپنے خون کے گھونٹ ہی پیتے ہیں۔ ہاں اب ہمارے اور افرنگی قائدین کے خون پینے میں واحد فرق صرف یہی رہ گیا ہے کہ وہ دشمن کا خون اکٹھا کر کے آپس میں انصاف سے برابر بانٹتے ہیں۔ جبکہ ہم لہو تقسیم کرتے وقت مساوات کا خیال نہیں رکھتے۔

تیل کو لہو سمجھ کے پیا جائے یا پھر لہو کو تیل سمجھ کر یہ لگتا تو کوئی عالمی کھیل ہے۔ لیکن اخبارات میں ایک ایسے لوکل کھیل کا روزانہ ذکر ہوتا ہے جو لاہور کی سڑکوں، دوکانوں اور گھروں میں عرصہ دراز سے کھیلا جا رہا ہے یہ ہے روزانہ لاہور میں دو کروڑ کے ڈاکوں کا کھیل اب تو اخبارات نے اس خبر کو کوئی مستقل کالم سمجھ کر اپنے اندرونی صفحات پر مخصوص جگہ عنایت کر دی ہوئی ہے۔ یہ لوکل کھیل بھی عالمی کھیل سے کچھ مختلف نظر نہیں آتا فرق محض یہ ہے کہ لاہور کی سڑک پر کھیلا جائے تو لوکل کھیل اور اگر بغداد یا بیت المقدس کی سڑکوں پر کھیلا جائے تو عالمی کھیل۔ آجکل بحیرۂ بالٹک میں چین اور روس کی خفیہ آبدوزوں نے چکر کاٹنے شروع کر دیئے ہیں۔ معلوم نہیں ان کو سویڈن میں کونسی دولت نظر آ گئی ہے بالکل ویسے ہی ڈاکو دن کے وقت لاہور کے پوش علاقوں کی ریکی کرتے ہیں اور پھر اسلحہ کے زور پر لوگوں کے گھروں میں گھس کر زیور پیسہ لوٹ لیتے ہیں، راہ چلتی یا گھروں میں کھڑی گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں لے اُڑتے ہیں نیز دوکانوں وغیرہ سے مال لوٹ لیتے ہیں۔ یہ سب ہمیں ایک ایسی فلم کی طرح دکھائی دیتا ہے جس کا شو روزانہ لاہور میں چلتا ہے اس شو میں صرف زیادہ مال والے کسی کمزوری کے باعث لٹتے ہیں۔ جیسے کہ عالمی کھیل کے منظر نامے میں تیل و دیگر معدنیات سے لدے ہوئے بظاہر کمزور ممالک لٹتے ہیں۔

ہم سمجھ رہے تھے کہ دنیا کے چند طالع آزما ممالک ہی یہ کھیل کھیلتے ہیں لیکن درحقیقت ہر طاقتور کمزور کو کھائے چلا جا رہا ہے۔ بڑے ہی پرانے محاورے ہیں کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"، یا "سروائیول آف دی فٹسٹ" یا "پیرنیٹر ھے کہ مُکا"۔ ہر طاقتور کمزور کو کھا کر ہی طاقتور بنتا ہے۔ وگرنہ دنیا میں عدل ہوتا تو شاید سبھی برابر ہوتے؟ اس فلاسفی کے مطابق کچھ ممالک ایٹمی طاقت بن کر کمزور ممالک کو دھمکاتے ہیں کسی نے بحری قزاقوں کے ذریعے مال لوٹا ہے کسی نے سونے کی چڑیا جیسے ممالک میں تجارت کی آڑ میں مال لوٹا تو کسی نے براہ راست حملہ کر کے ملک ہڑپ کر لئے کسی

نے جمہوریت کا شوشہ چھوڑ کر دوسروں کی گردن ناپی کسی طرف سے حقوق انسانی وحقوق نسواں کا پرچار کر کے نقب لگانے کی کوشش کی گئی اور کسی نے معاشی دیو بن کر پوری دنیا کو دبوچنے کا پروگرام بنا رکھا ہے لیکن ان سب ممالک نے اپنی قومی سطح پر ایسی پالیسیاں اپنائیں ہیں کہ دوسرے ممالک تو ان کے سامنے سرنگوں ہوتے چلے گئے مگر اپنے عوام سے دھوکہ نہ کیا گیا۔ ہاں ایک اپنا پیارا پاکستان ہے کہ جہاں ایک ہی ملک کے رہنماؤں نے اپنا پورا زور لگا کر ایسی پالیسیاں جنم دی ہیں کہ اپنے ہی ملک اور عوام کو کمزور کر دیا ہے لیکن بیرونی طاقتوں کے سامنے سرنگوں کر دیا ہے۔ کیا خیال ہے علامہ صاحب کا اس بارے میں؟

جمہوریت کا جنسی سفر

دنیا میں جنسی طور پر پھیلنے والی بہت سی بیماریاں ہیں جنہیں ایس ٹی ڈی یعنی 'سیکشولی ٹرانسمٹڈ ڈزیز' کہا جاتا ہے مثال کے طور پر ایڈز۔ ان بیماریوں میں جنسی اختلاط سے وائرس وغیرہ ایک سے دوسرے شخص میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں جمہوری رویوں کی پامالی نیز اصل جمہوریت کو خاندانوں میں قید رکھنے کی کامیاب کوششوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ ستم ظریفوں نے حال ہی میں ایس ٹی ڈی میں جمہوریت کو بھی شامل کرلیا ہے۔ کیونکہ ڈی سے اگر ڈزیز بنتی ہے تو ڈی سے ہی ڈیموکریسی بھی بنتی ہے۔ بلکہ ڈی سے ڈی چوک بھی بنتا ہے جس کو بعض لوگ ابھی تک جمہوریت کی گارنٹی سمجھ رہے ہیں۔ آیئے آپ کو اپنے دلچسپ ملک کی سیر کرائیں جہاں جنسی طور پر پھیلنے والی بیماریوں میں سے ایک "جنسی جمہوریت" بھی ہے اور جہاں چند خاندانوں نے سیاست کو اپنے گھر کی لونڈی کے طور پر پال رکھا ہے اور وقتاً فوقتاً ملک کے سیاسی نظام میں اپنے "ذاتی پیدہ کردہ" جمہوری بچے یا کسی قریبی رشتہ دار کے بچے یکے بعد دیگرے پھینکتے چلے جارہے ہیں۔

انکل بدروح جنسی جمہوریت کی اصطلاح سُن کر چونک پڑے ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ جنسی جمہوریت کیا کوئی مشغلہ ہے یا کاروبار؟ اب ہم انہیں کیا بتائیں کہ ایک خود ساختہ جمہوری لیڈر جب اپنے بچوں کے اندر ہی جمہوریت تقسیم کرے گا تو کیا اسے "جنسی طور پر پھیلائی گئی جمہوریت" نہ کہیں گے؟ ہمارے ہاں جس طرح عدل ڈھونڈنا ہو تو "ایوانِ عدل" کی عمارت کے ماتھے پر لکھا دیکھ لیں۔ اسلام کی تلاش ہو تو پاکستان کے صدر مقام "اسلام آباد" پر غور فرمائیں۔ ویسے ہی اگر جمہوریت ملاحظہ کرنی ہو تو آمرانہ ذہن رکھنے والے خاندانی سیاستدانوں کے ان بچوں کو دیکھ لیں جو مغرب سے خصوصی تعلیم و تربیت لے غریب عوام کو مزید بے کس و مجبور کرنے کے لئے کمر کس رہے ہیں۔

تعلیم اور صحت کی طرح چونکہ سیاست بھی ایک کاروبار کی شکل اختیار کر چکی ہے اس لئے یہ ایک طرح کی جنگ ہے جس میں "سب کچھ جائز" سمجھا جاتا ہے اور یہاں تک بھی عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک دی جاتی ہے کہ اگر اپنے تمام بچے مر بھی جائیں تو بیٹی کے بچوں کو بھی جانشین مقرر کیا جاسکتا ہے مزید براں یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ بیک وقت کئی بیٹے، بیٹیاں اور بھتیجے بھانجے وغیرہ سیاسی دوکان پر بٹھا دیئے جاتے ہیں تاکہ اگر ایک دو پٹ بھی جائیں تو بھی حکومت اپنے ہی ہاتھ میں رہے۔ اصول کو "وصول" کے معنوں میں رواج دے کر "انتشار" پیدا کر کے "اقتدار" اپنے ہی ہاتھ میں رکھا جاتا ہے نیز فساد کو "مفاد" کہہ کر "ذاتی" "ہانڈی کو" "ملکی" "مصالحے کا تڑکا لگا دیا جاتا ہے پھر "قرضہ" سرمایہ کاری بن جاتا ہے اور "عالمی قرض" کو "گرانٹ" کہہ دیا جاتا ہے۔ اوپر سے بھلا ہو میڈیا کا جس میں اپنی اپنی قیمت وصول کرنے والے جغادری پہلوان تیار بیٹھے ہوتے ہیں تاکہ ان تبدیل شدہ اصطلاحات کا اس قدر شور مچائیں کہ اَن پڑھوں کو یہ الفاظ

چچ لگنے لگ جائیں اوران کے ساتھ ساتھ عوام کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں نمک جتنے باشعور لوگ بھی الجھن کا شکار ہو جائیں نیز یہ معدودے چند انٹیلیکچو ل اگر کبھی اپنا طوطی بلند کرنا بھی چاہیں تو نقارخانے میں شور مزید بلند کردیا جائے تا کہ ان کی آواز با آسانی دفن کی جاسکے۔

اب تک ہمارے ''رہنماؤں'' نے جو ہمارا لہو چوستا تھا چوس چکے لیکن ہمیں پھر بھی اس بات کا ادراک ہونا چاہیے کہ ان کے بچوں نے بھی سیاست کو کاروبار سمجھتے ہوئے رہا سہا لہو منافع کے طور پر چوسنے کا پروگرام بنالیا ہے۔ ہر بڑی سیاسی پارٹی نے کوئی نہ کوئی ایسا بچہ جنم دے رکھا ہے کہ جو حریص و خونی نظروں سے ہمارے بچوں کو گھور رہا ہے۔ اور ہاتھ کے اشارے سے کہہ رہا ہے کہ ''بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی؟''

ابھی کل کی بات ہے کہ ہم نے خلافت میں سے تقوی نکال کر وراثت ڈال دی تھی۔ جس سے بادشاہت نے جنم لے کر آہستہ آہستہ دین کی روح قبض کرلی اور آج دین نے مذہب کی شکل اختیار کرلی ہے۔ نقصان تو کوئی خاص نہیں ہوا سوائے اس کے کہ چند خاندانوں نے جی بھر کے دنیاوی دولت کے مزے لوٹ لیے مگر دیگر نوے فیصد مسلمان دنیا بھر میں ذلیل و خوار ہونے کے لیے چھوڑ دیے نیز دنیا بھر سے اسلام بحیثیت ملکی نظام بالکل عنقا ہو چکا ہے۔ اسی کامیاب ماڈل کو عام پبلک تو شائد نہ سمجھ سکی ہوگی مگر ہمارے موجودہ حکمرانوں کے زرخیز دماغوں والے آباواجداد نے انگریز کی غلامی اختیار رہی اسی نکتہ نظر سے کی تھی کہ آج بھلے سے لوگ انہیں غدار یا ظالم ہی سمجھتے رہیں مگر انہیں برا سمجھنے والوں کی اگلی تمام نسلیں انکی آنے والی نسلوں کی غلام ہی رہیں گی، روئیں گی سر پیٹیں گی لیکن کر کچھ نہ سکیں گی۔ اور آج؟ آج وہی کچھ تو عملاً ہوا ہے۔ کم و بیش وہی مسلمانوں سے غداری کر کے اور انگریز کے کتے نہلانے والے ہی تو ہم جیسے مما لک کے حکمران بنے بیٹھے ہیں فرق صرف طرز حکمرانی کا ہے جب وائسرائے شپ مقبول تھی تو بھی یہی خاندان پیش پیش تھے اور اگر آج جمہوریت سکہ رائج الوقت ہے تو پھر بھی گھوم پھر کر وہی۔ بس طاقت صرف جنسی حکمرانی کی ہے۔ یہ لہو پینے کا عمل ہے۔ ''جو بڑھ کے تھام لے مینا اسی کا ہے''۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بے شعور عوام خود ہی جہالت کے اندھیرں میں ڈوب کر خرمستیاں کرنا چاہ رہی ہو تو کون اس کو کنارے پر لائے گا؟ یقیناً جنسی جمہورت والے تو کبھی ایسا نہ چاہیں گے کہ عوام جاگ جائے اوران کا سیاسی کاروبار ٹھپ ہو جائے۔ لہٰذا ایک ہی طریقہ بچا ہے کہ عوام کی شمولیت والے اداروں کو پنپنے سے روک دیا جائے تا کہ قوم غریب کی غریب ہی رہے اور سارا رس ''پولی ٹکس'' یعنی رس چوسنے والے بہت سے کیڑے پی جائیں۔ حال ہی میں امریکہ میں چھپنے والی ایک کتاب کا کافی چرچا ہو رہا ہے جس کا عنوان ہی یہ ہے کہ ''قومیں ناکام کیوں ہوتی ہیں؟'' [Why Nations Fail?]۔ اس میں کامیاب اور ناکام قوموں کے سفر کے طریقہ کار پر بحث کرنے کے بعد مصنفین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کامیاب قوموں کا طرۂ امتیاز ''شمولیاتی اداروں یا انکلوسو انسٹی ٹیوشنز'' کی بڑھوتری ہے مثلاً ایسے معاشی ادارے جن کا سفر گراس روٹ سطح سے اوپر کی طرف یوں جاری رہے کہ جہاں ان کو وسیع البنیاد سیاسی ادارے کنٹرول کر رہے ہوں یعنی نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی اور ناکام قوموں کا طریقۂ واردات یہ ہوتا ہے کہ وہ ''کشیدہ اداروں یا ایکسٹریکٹو انسٹی ٹیوشنز'' پر توجہ مرکوز رکھ کر معاشی اداروں کو ذاتی حیثیت سے چلاتے ہیں لیکن وصولیاں

ریاست سے کرتے ہیں۔

اس قدر خشک اور بور سبق یاد رکھنے سے بہتر ہے کہ جس طرح بھی ہمارے ملک کی جنسی جمہوریت پروان چڑھ چکی ہے اسی کو مزید پانی دیں اور ووٹ ڈالتے وقت قطعاً پرواہ نہ کریں کہ سیاسی پارٹیاں خاندانی ہیں یا لسانی و مذہبی وہ اپنے منشور پر عمل کرنے کے قابل ہیں بھی یا نہیں ان کا ریکارڈ عام آدمی کو غربت کی مزید اتھاہ گہرائیوں میں گرانے کا ہے یا مڈل کلاس کو وسعت دینے کا ہے۔ یہ تو لہو پینے کا ایک ایسا عمل ہے جو پورے انسانی گروہوں میں پھیل سا گیا ہے۔ آؤ ہم بھی قریب ترین کمزور کا لہو پینے کا کوئی حیلہ جلدی سے کرلیں ورنہ ہمارا گرم خون ہم سے زیادہ طاقتور بس پی ہی لینے کو ہے۔

جیل سُسرال ہتھکڑی زیور

فرزندِ راولپنڈی اور عمران خان کے ''فصلی دوست'' شیخ رشید صاحب نے اگلے روز جوشِ خطابت میں فرمایا ہے کہ جیل میرا سُسرال ہے اور ہتھکڑی میرا زیور۔ اگر وہ اپنے اس بیان کا دھیان سے استعمال کرتے تو غالباً یوں کہتے کہ ''جیل اور ہتھکڑی میرا اوڑھنا بچھونا ہے'' اس طرح یقیناً ان کی مردانگی پر دھبہ لگنے کا اس طرح کا خدشہ نہ ہوتا جو اس بیان سے مترشح ہو رہا ہے۔ ان کے اس بیان کا حیاتیاتی یعنی بیالوجیکل جائزہ ان کو مرد کی بجائے عورت ثابت کر رہا ہے۔ کیونکہ ہمارے سماج میں سُسرال میں جا کر بہو ہی رہتی ہے۔ ابھی داماد کے رہنے کا زیادہ رواج نہیں پڑا ہے نیز جہاں تک زیور کی بات ہے تو زیور بھی عورت ہی کے استعمال کی چیز سمجھی جاتی ہے اور اگر مرد غلطی سے یہ دعویٰ کر بھی دے کہ ہتھیار یا ہتھکڑی ہمارا زیور ہے تو یہ بذاتِ خود خالصتاً ''عورت پنا'' سمجھا جاتا ہے نیز بات بھی کچھ فلمی سی ہی لگتی ہے اس طرح کا دعویٰ سنتے ہی قبل از وقت اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ مرد اگر عورت کی طرح زیورات سے مرصع ہونے پر یقین رکھتا ہے تو سمجھ لو کہ مارا جائے گا بے چارہ بیچ منجدھار کے کیونکہ مردِ میدان زیور وغیرہ کا ذکر نہیں کرتے۔ ہمیں شیخ رشید کے اس زنانہ انداز پر زیادہ ہنسی نہیں آئی لگتا ہے کہ اُن کا قصور کم ہے کیونکہ ان کی زندگی میں چونکہ عورت داخل نہیں ہو پائی اس لئے شاید وہ خود ہی عورت بن کر اس کمی کو پورا کرنا چاہ رہے ہوں گے۔

سیاست میں اشارے کنائے دراصل بہت چلتے ہیں اس لئے عین ممکن ہے شیخ رشید صاحب اشارتاً عمران خان کو سمجھا رہے ہوں کہ جناب تیار رہئے کسی بھی وقت زیورات سے مرصع ہو کر سُسرال جانا پڑ سکتا ہے۔ کچھ اس طرز کی دھمکیاں خان صاحب کو وزیرِ اطلاعات پرویز رشید سے بھی مل رہی ہیں اور اگر خدانخواستہ خان صاحب یا شیخ صاحب سسرال پہنچا دیئے گئے تو پھر ان کے سُسرالی رشتے دار دراصل پرویز رشید ہی بنتے ہیں۔ جو ابھی تک تو خان صاحب کو سُسرالی طرز کی دعوتیں دے رہے ہیں لیکن وہاں پہنچتے ہی یہ نہ ہو کہ کہیں سالے والا کردار نبھانا شروع کر دیں۔ اب نہ تو فلم سٹار علی اعجاز دنیا میں رہے ہیں اور نہ ننھا اس لئے فلم ''سالا صاحب'' والے ایکشن مجبوراً پرویز رشید ہی کو دہرانے پڑ سکتے ہیں۔ مذکورہ فلم کا ایک مشہور ڈائیلاگ تھا کہ ''بندہ کتا بن جائے پر سالا نہ بنے'' یہ ننھے صاحب کی سُسرال پر ایک غیر اخلاقی اور شدید تنقید سمجھی جا سکتی ہے مگر کسی بھی طور پر سالے کی توہین کر دینا یوں مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ سالا ایک پاکیزہ اور جذباتی رشتہ ہوتا ہے جو یقیناً کتوں کے ہاں نہیں پایا جاتا۔

شیخ رشید صاحب چونکہ ذاتی سطح پر نکاح وغیرہ کی تہمت سے محروم ہی رہے ہیں اس لئے پاکستان میں ان کی سیاسی وراثت کا تو چانس نہیں بن سکتا۔ بس اب ان کے انفرادی وجود کا سیاسی طور پر زندہ رہنا بہت ضروری ہو گیا ہے اور وہ بھی صرف صاحبِ اقتدار کی حیثیت سے ہی ورنہ وہ نہ اِدھر کے رہیں گے اور نہ اُدھر کے اور انسانوں کے جنگل میں ناچتے

بھی پھریں گےتو کون توجہ دے گا؟ اب ہر دن اتوار تو نہیں ہوتا اور ہر دور جنرل مشرف کا بھی نہیں ہوتا۔ درمیان میں جس طرح ہڈی آ سکتی ہے اسی طرح شریف برادران نے بھی ان کے کباب خاصے بے مزہ کئے ہوئے ہیں۔ بہ امر مجبوری یہ بہر حال شیخ صاحب کا ایک سمجھدارانہ فیصلہ ہے کہ انہوں نے جناب عمران خان سے سیاسی عقد کرلیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک واحد راستہ رہ گیا ہے کہ وہ اپنی اکیلی سیاسی پارٹی کے اکیلے رُکن کی حیثیت سے اقتدار میں آ جائیں ورنہ اچھی بھلی سیاسی پارٹیاں بھی مسلسل قلابازیاں کھانے اور ڈرامے بازیاں دکھانے کے باوجود اقتدار سے محروم رہتی ہیں۔ یہ اچھا ہے کہ وہ اپنی پارٹی میں اکیلے ہی پائے جاتے ہیں۔ ورنہ اگر خدانخواستہ ان کی پارٹی میں زیادہ لوگ غلطی سے آ گئے تو ہوسکتا ہے کہ ان کے اپنے اندازِ گفتگو کے باعث اندرونِ جماعت ہی ان کے خلاف غدر مچ جائے۔ عقد سے ایک بات یاد آ گئی ایک عاشق تازہ کو بہ امر مجبوری دیارِ غیر جانا پڑ گیا۔ خیر دل پر بھاری پتھر رکھ کر وہ روزانہ اپنی محبوبہ کو خط لکھنے لگ گیا کہ چلو ہاتھوں میں ہاتھ نہ سہی خطوں میں خط تو رہے گا کچھ عرصہ بعد محبوبہ نے عاشقِ نامراد کو یک طرفہ نوید سنائی کہ میں تو تمہارا انتظار کرنا چاہتی تھی لیکن تم نہ آئے تو مجبوراً میں نے روزانہ آنے والے ڈاکئے سے شادی کرلی ہے۔

عمران خان پچھلے برس دیارِ غیر میں قادری صاحب کی معیت میں جس توپ خانے سے ملے تھے اور بہت سارے وعدے وعید ہونے کے ساتھ ساتھ شیروانیاں تک سل گئی تھیں ان کے ساتھ بعد ازاں پیغام رسانی کا فریضہ جناب شیخ رشید نے برقرار رکھا تھا کیونکہ کئی پرتوں کے پیچھے مستور توپیں خصوصاً میڈیا کی ایکٹوزم والے ایام میں بے حجابانہ گھن گھرج نہ سکتی ہونگی لہذا شیخ صاحب ہی ادھر کے پیغامات اُدھر لئے لئے پھرتے رہے ہوں گے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا؟ روائتی عشق کی طرح دونوں طرف سے کچھ غلط فہمیوں نے جنم لے لیا ہوگا۔ لہذا دو یار اقتدار میں تو نہ آ سکے لیکن پیغام رساں کا روز افزوں ملاقاتوں سے خان صاحب کی پارٹی سے سیاسی عقد ہوگیا۔ اس پر پی ٹی آئی کے خیر خواہوں کو لازماً دھڑ کا لگا رہا ہوگا کہ جس طرح شیخ صاحب نے اپنے تعمیری بیانات سے آل پاکستان مسلم لیگ اور پھر ق لیگ کو شکست سے دوچار کیا ہے اس سے ڈر لگنے لگ گیا ہے کہ سوونوں پر مشتمل "ریزہ ریزہ دھرنا" جس طرح "قطرہ قطرہ قلزم" نہیں بن پایا تو کہیں پی ٹی آئی کی ہوا بھی اکھڑنا شیخ صاحب ہی کے مبارک ہاتھوں سے نہ لکھا ہو؟ دیکھیں ناں! ہم سے سیانے خان صاحب ہیں، ان سے سیانے جہانگیر ترین، شاہ محمود قریشی اور شیخ رشید ہیں۔ اور ان سب سے سیانے شریف برادران۔ ان سے بھی عقلمند اور دور کی کوڑی لانے والے جناب حسن نثار ہیں۔ اور ان کے بھی استاد اسٹیبلشمنٹ والوں کے درجنوں جاں نثار! ہم کہاں مشورہ دینے کے قابل ٹھہرے ہمیں تو خان صاحب کی ڈوبتی ساکھ میں شیخ کے سُسرال اور زیورات کی کھنک بھی سنائی دے رہی ہے۔ اب اوول کا ہیرو جانے یا دھرنے کے زیرو جانیں۔ ہم کیا ہماری وقعت کیا؟ ہم نے تو تہیہ کر رکھا ہے کہ ہم ملکی سیاست کو ٹی وی ڈرامہ سمجھ کے لطف اندوز ہوں گے صرف تفریح طبع اور وقت گزاری کے لیے۔ ہمیں اس سے کیا سروکار کہ ڈرامہ نگار نے کیا لکھ رکھا ہے؟ ہدایت کار کس طرح کی اداکاری چاہ رہا ہے؟ اداکار ترنم سے ڈائیلاگ جھاڑنے میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں؟ یا ناظرین کہاں تک معاملات کی تہہ تک پہنچ پائے ہیں؟ ساہنوں کی؟ ہم تو شیخ صاحب کی آنیوں جانیوں سے اندازے لگاتے رہتے ہیں کہ توپچی کہاں ہیں اور توپوں کا رخ کس طرف ہے؟

برگر کراوڈ

30 نومبر کو بقول حکومت وقت اسلام آباد میں عمران خان نے برگر کراوڈ اکٹھا کر لیا تھا۔ ہم نے یہ خبر جب چائے پر اپنے ریٹائرڈ ایڈوائزر کو سنائی تو موصوف نے سادگی سے پوچھا کہ کیا عمران خان وہاں لوگوں کو برگر بھی کھلاتے ہیں؟ ہماری وضاحت پر کہ اس اصطلاح کا مطلب ہے کہ عمران خان کو پاکستان کی برگر کلاس یعنی طبقۂ امراء کا نمائندہ ہونے کا طعنہ دیا گیا ہے یعنی بالفاظ دیگر وہ جو ہزاروں لوگوں کا اجتماع اسلام آباد میں دیکھا گیا ہے وہ دراصل پاکستان کے دس فی صد اشرافیہ کا تھا جو ماضی وحال کی تمام حکومتوں کا حصہ رہے ہیں لیکن اب انہوں نے مستقبل میں بھی پاکستان کی حکومت پر قابض رہنے کے لئے عوام کے بدلتے تیور دیکھتے ہوئے پی ٹی آئی کو سپورٹ کرنے کا پروگرام بنالیا ہے۔

ہمارے سادہ دل لیکن ذہین ایڈوائزر طعنے کی گہرائی پا گئے تو فرمانے لگے کہ ایک لحاظ سے تو حکومت نے بظاہر عمران خان پر چوٹ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کو اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ چوٹ حکومت نے اپنی اور اپنی ''سہیلی'' اپوزیشن پارٹی پر بھی کر دی ہے کیونکہ ن لیگ اور پی پی دونوں کی قیادت کا تعلق سو فی صد طبقۂ اشرافیہ سے ہے۔ جبکہ ان کو غریب عوام اپنے ووٹ کا دھکا لگا کر ایوان حکومت میں جب پہنچاتی ہے تو بیچارے رہنما حواس باختہ ہو کر اسی عوام کے خون سے مزید برگر کلاس بن جاتے ہیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو معاملات مزید عیاں ہو جاتے ہیں۔ یعنی حکومت پر قبضہ ہمیشہ اشرافیہ کا رہتا ہے لیکن ان کے بے بس ووٹر یعنی غریب عوام تن کے کپڑے تک گنوا کر یہی سمجھتی رہتی ہے کہ حکومت ان کی اپنی ہے اس طرح اپنی پسندیدہ پارٹی کے حکومت میں آتے ہی وہ اپنے خالی پیٹ کا پورا زور لگا کر جب اس کے حق میں نعرے لگاتے ہیں تو چند برسوں کے اندر ہی اندر ان کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ یہ محسوس کر کے کہ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ غریب ہو چکے ہیں اور ان کے ''پسندیدہ'' رہنما پہلے سے زیادہ امیر ہو چکے ہیں، تو اس سے قبل کہ بھوکی عوام کا صبر چھلک پڑے، ایک نئی پارٹی یا کسی اور گھسی پٹی پارٹی کا کوئی نیا لیڈر اچانک اوپر سے کہیں ننگ دھڑنگ اور سادہ لوح عوام کے بیچوں بیچ چھلانگ لگا کے آن وارد ہوتا ہے اور نئے نعروں کا لولی پوپ بیچنا شروع کر دیتا ہے۔ اصل طاقت پھر امیر کے پاس لوٹ جاتی ہے اور پھر سیاست سیاست کے کھیل کا پانچ سالہ دور گزر جاتا ہے۔ لیڈر بے شک عوام کے بھرے جلسوں میں اپنا کوٹ اچھال اچھال کر یا پسینہ پونچھ کر ٹشو پیپر اچھال اچھال کر لوگوں کو دھوکہ دیتا رہے کہ یہ غریبوں کی حکومت ہے، یا آپ کی اپنی حکومت ہے، یا یہ عوامی حکومت ہے، لیکن درحقیقت وہ پہلے سے زیادہ امیر اور پہلے سے زیادہ طاقتور ہو چکا ہوتا ہے اور نتیجے کے طور پر پہلے سے زیادہ کایاں، طالع آزما اور موروثی سیاست میں اپنے بچے داخل کر چکا ہوتا ہے۔ سیاست سے بدظن ایڈوائزر صاحب کے اس جوش کا صرف اتنا سا نقصان دیکھنے میں آیا کہ محض ان کی چائے ہی ٹھنڈی ہوئی لیکن ارد گرد کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

برگر کراؤڈ کہہ کر حکومت نے دراصل پی ٹی آئی کو یہ نوید سنائی ہے کہ اب آپ بھی حکومت حاصل کرنے والی سٹیج پر آ چکے ہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے 1970ء میں پیپلز پارٹی حکومت لے اڑی تھی۔ اور بالکل ویسے ہی جیسے 1990ء میں ن لیگ نے حکومت اچک لی تھی۔ حالانکہ بھٹو نے براہ راست غریبوں کو مخاطب کیا تھا اور اکٹھا بھی کر لیا تھا لیکن وہ خود بے حد امیر اور بہت بڑے جاگیردار تھے۔ لہٰذا وہ اور ان کے ساتھی امیر سے امیر تر مگر عوام غریب سے غریب تر ہوتی چلی گئی۔ نواز شریف نے تو مخاطب ہی سرمایہ داروں کو کیا تھا۔ اس لیے اگر بعد میں سرمایہ داروں نے عوام کا لہو چوس بھی لیا ہو تو ن لیگ کا ذمہ اوس پوس۔ جس طرح دونوں پارٹیوں کی اعلیٰ قیادت میں نہ کوئی غریب تھا نہ ہے اور نہ ہو گا۔ اسی طرح مستقبل میں اگر پی ٹی آئی حکومت چھین پائی تو الحمدللہ اس کی اعلیٰ قیادت میں ایک شخص بھی غریب نہ ہو گا اور پھر قیادت کے تمام سرخیل امیر ہوتے چلے جائیں گے۔ طاقتور رہوتے چلے جائیں گے۔ اور جہاں تک غریب کے دن پھرنے کا تعلق ہے تو ان کے دن اس طرح پھریں گے کہ پہلے اگر کوارٹر میں رہائش پذیر تھے تو اب خیمے میں منتقل ہو چکے ہوں گے۔ پہلے اگر دن میں دو بار روکھی سوکھی روٹی کھاتے تھے تو اب دن بھر میں صرف ایک بار سوکھی روٹی پیاز کے ساتھ کھا لیں گے۔

یہ بدگمانیاں کیوں ہمارے دماغ میں در آئی ہیں؟ آیئے دیکھیں۔ پیپلز پارٹی کی ساری قیادت جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ ن لیگ کی ساری قیادت سرمایہ دار طبقے کی امین ہے۔ اور بقول حکومت پی ٹی آئی کی ساری اعلیٰ قیادت برگر فیملی یعنی اشرافیہ کی سرخیل ہے۔ اگر ان تینوں پارٹیوں کے اکابرین میں امارت مشترک ہے تو ان کے مجبور و مقہور ووٹروں میں غربت کا اشتراک ہے۔ بس اس حوالے سے پیپلز پارٹی کے بعد ن لیگ کی حکومت رہی ہے اور آئندہ یہ تاج پی ٹی آئی کے سر سجایا جا سکتا ہے۔

ہمارا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ ان تینوں پارٹیوں میں چونکہ بہت سی اقدار مشترک ہیں اس لئے ان کی منزلیں بھی مشترک ہیں۔ ہمارا خیال پی ٹی آئی میں عمران خان کی موجودگی کی وجہ سے تھوڑا سا مختلف ہے۔ اور وہ اس طرح کہ عمران خان کو جیسے پی ٹی آئی کسی اور قوت نے بنا کر تھمائی ہے تا کہ شراب کی پرانی بوتل میں عمران خان کی پرکشش شخصیت کا لیبل لگا کر اس کو سب طبقات میں پذیرائی مل سکے اور جونہی اس سکیم کے ساتھ پی ٹی آئی اقتدار میں آ جائے تو پھر عمران خان کو اس طرح پس پردہ کر دیا جائے۔ جیسے قائداعظم کو کر دیا گیا تھا یا پھر زرداری خاندان نے بھٹو خاندان کو کر دیا ہے۔

اگر قارئین کو ہماری بات کا یقین نہ آئے تو عمران خان، نواز شریف اور آصف زرداری کے جلو میں ذرا دائیں بائیں نظریں دوڑا کے دیکھیں۔ وہاں جاگیردار بھی کھڑے نظر آئیں گے سرمایہ دار بھی دکھائی دیں گے۔ اور اگر نظر نہیں آئے گا تو وہ یقیناً ''عام آدمی'' ہو گا۔ عام آدمی کو ان سب نے محض ووٹ لینے کے لیے رکھا ہوا ہے۔

ساہنوں کی؟

کسی سیانے نے ''کی ٹو سکسیس'' یعنی کامیابی کی بہترین ''چابیوں'' میں سے جو سب سے اچھی چابی بتائی ہے وہ ہے ''ساہنوں کی''۔ یعنی یہ وہ چابی ہے جو کامیابی کی طرف کھلنے والے ہر دروازے کو لگ جاتی ہے۔ بقول شفیق الرحمان کہ ''دنیا میں جو بھی کچھ ہو رہا ہے کوئی ہماری مرضی سے یا ہم سے پوچھ کر تھوڑا ہی ہو رہا ہے'' لہٰذا ''ساہنوں کی؟''۔ بے شمار مصیبتیں اگر دائیں بائیں سے چھلک چھلک کے حملہ آور ہو رہی ہوں اور ذہنی تناؤ میں اضافہ کرتی چلی جا رہی ہوں تو اس دلدل سے نکلنے کا بہترین راستہ یہ ہے کہ ''ساہنوں کی؟'' کہہ کر نوے فیصد پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ ہمارے ساتھ کچھ ذاتی اور کچھ عالمی مشکلات ہمہ وقت چمٹی رہتی ہیں اگر ہم ان سب کے اثرات قبول کرتے چلے جائیں تو پتہ چلے گا کہ ہم نے محض اپنا خون ہی جلایا ہے جبکہ ہمارے قیمتی خون جلانے کا کسی پر رتی بھر اثر بھی نہیں ہوا۔ وجہ یہ کہ ان مسائل کے حل کی کُنجی یا ریموٹ کنٹرول کسی اور کے پاس تھا۔ پہلے ذرا عالمی مسائل پر نظر ڈالتے ہیں مثلاً دنیا بھر کے دھوئیں کے مرغولوں نے اگر اوزون کی تہہ چھیل کر رکھ دی ہے تو کیا ہماری مرضی سے چھیلی ہے؟ لہٰذا ''ساہنوں کی؟''۔ سمجھ بوجھ والے لوگ جانیں یا ماحولیات کا دلدر پال کر مخولی باتیں کرنے والے سائنسدان جانیں تو جانیں ''ساہنوں کی؟''۔ اگر پاکستان نے چھ سو میل تک مار کرنے والا میزائل بنا لیا ہے تو ''ساہنوں کی؟''۔ ہم نے کون سا میزائل نہ چلنے کی صورت میں اسے پنکچر لگانے ہیں؟ اگر جواب میں ''بھارت نے فضا میں جاسوسی سیارے چھوڑ دیئے ہیں تو ''ساہنوں کی؟'' ان سیاروں سے کون سا ہم نے ان گڈیوں کے پیچے لڑانے ہیں جن پر پنجاب حکومت نے پہلے ہی پابندی عائد کر رکھی ہے۔ اب کچھ ذاتی مثالیں ملاحظہ کریں۔ اگر گھر والے پی ٹی آئی کو پسند کرنے لگ گئے ہیں تو ''ساہنوں کی؟''۔ پی ٹی آئی پٹ گئی تو ہم دانشور کہلائیں گے۔ اور اگر بازی لے گئی تو ہم گھر والوں کے ساتھ۔ ایسے ہی اگر دفتر والی خاتون ہمارے علاوہ کسی اور کو بھی دیکھ کے مسکراتی ہے تو ''ساہنوں کی؟'' کیونکہ وہ بیچاری تو اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داری نبھا رہی ہے۔ ہماری سوچوں کو اگر کھوتا کھا گیا ہے تو اس بھلی مانس کا کیا قصور؟۔ اسی طرح اگر ہمارا ابا کر ہمارے دفتر روانہ ہونے کے بعد گھر میں اخبار پھینکتا ہے تو ''ساہنوں کی؟''۔ ہم نے کونسا وقت پر اخبار پڑھ کر روز زیروں یا ڈاکوؤں کو نکیل ڈال لینی تھی؟۔

ہمیں یاد پڑتا ہے کہ کوئی بائیس برس قبل ہم جب یورپ سے ڈاکٹریٹ لے کر لوٹے تو ہم نے بہن بھائیوں کو بات بات پر ''ساہنوں کی؟'' کہنا شروع کر دیا۔ بڑی بہن ظالم کی دور اندیش تھیں تاڑ گئیں کہ ہم کامیابی کے نشے میں چور ہیں اور ڈھکے چھپے الفاظ میں یہ پیغام دے رہے ہیں کہ ''تم سب جاؤ بھاڑ میں، ساہنوں کی؟''۔ آج وقت کے جبر نے اس دوری پر بیٹھ کر ہمیں احساس دلایا ہے کہ بہن بھائیوں کی مخاصمانہ ''شفقت'' کے پیچھے حقیقتاً ہماری ہی ''مچکریں'' شامل

حال تھیں وگر نہ آج وہ ہم سے اتنے دور نہ ہوتے اب معلوم نہیں کہ بہن بھائیوں کے مسائل سے چھٹکارا ہمیں اس کامیاب چابی نے عطا کیا ہے؟ یا پھر اُن سب کا ہم جیسے شیطان سے چھٹکارا اُن کی ''ساہنوں کی؟'' جیسی حکمتِ عملی کا شاخسانہ تھا؟ اب تو ہم محض یہ نغمہ ہی گنگنا سکتے ہیں کہ

ہم سے آیا نہ گیا ان سے بُلایا نہ گیا
فاصلہ پیار میں دونوں سے مٹایا نہ گیا

یہ ''ساہنوں کی؟'' والے رویئے سے کل البتہ ہمیں ذرا سی شرمندگی بھی محسوس ہوئی جب ہم نے تعریف طلب نگاہوں سے دوستوں کی محفل میں یہ اعلان کیا کہ ہمارے گھر میں پچھلے سترہ برس سے ٹی وی آن نہیں کیا گیا۔ جس پر کچھ دوستوں نے ہمیں چڑانے کے لیے ہمارا ہی ایجاد کردہ نعرہ ہمیں واپس لوٹا دیا، کورس کی شکل میں یہ کہہ کر کہ ''ساہنوں کی؟''۔ دوسری شرمندگی اس وقت ہوئی جب آج بھائی دفتر میں کسی کام سے ہمیں ملنے آئے اور بیٹھتے ہی استفسار کیا کہ عمران خان کے ''ملک بند'' کرنے کے سلسلے میں آج فیصل آباد میں کیا ہو رہا ہے؟۔ ہم نے لاپرواہی سے جواب دیا کہ ''ساہنوں کی؟''۔ یار کل کے اخبار میں پڑھ لیں گے لیکن انہوں نے وائی فائی کا پاس ورڈ زبردستی لے کر ''فیس بک'' کھول لی اور پھر ہولناک خبروں کا سلسلہ وکھری ٹائپ کے کھرے سچ سنانے کے انداز میں چلا دیا۔ ہم نے بھی ہر خبر پر ''ساہنوں کی؟'' کی رٹ لگائے رکھی لیکن مجال ہے انہوں نے ''کامیابی کی چابی'' یعنی ساہنوں ''کی'' کو ذرا سی بھی وقعت دی ہو۔ ہر خبر وہ یوں سناتے رہے کہ جیسے اس کے بعد مارشل لاء کی نوید دینے والے ہوں بالآخر ہماری ''ساہنوں کی؟'' کام آ گئی اور ان کے منہ سے بھی نکل ہی گیا کہ چل یار اگر فیصل آباد میں ایک دو افراد مر بھی گئے ہیں تو ماڈل ٹاؤن کے چودہ مردوں نے کون سا شہباز شریف کے کانوں کے اوپر جوؤں کو ریمپ واک کرا دی تھی کہ جن کے رینگنے سے پنجاب حکومت کے افسران بالا کو بھی خارش کا عذاب سہنا پڑا ہوگا؟

آج جو بھی کامیاب لوگ ہمارے حکمران بنے بیٹھے ہیں وہ درحقیقت اسی کامیابی کی ''چابی یعنی کی'' کا عملی طور پر بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ چند شاہکار ملاحظہ کریں۔ ☆ تھر میں دھڑا دھڑ بچے غذائی کمی کے باعث مرتے چلے جا رہے۔ جواب آتا ہے کہ ''ساہنوں کی؟ یہ بھوک سے تھوڑی مر رہے ہیں دراصل ان میں غربت کے باعث کیک خریدنے کی سکت نہیں رہی اس لئے مر رہے ہیں'' ☆ بھارت سرحدوں پر مسلسل جارحیت کر رہا ہے۔ ''ساہنوں کی؟ کیا عوام کو علم نہیں کہ بھارتی انڈسٹری میں ہمارا جو اربوں روپیہ لگا ہوا ہے ہم نے بھارت کو جواب دے کر اس کا کریا کرم کرانا ہے کیا؟'' ☆ گھروں اور فیکٹریوں میں اس سال گیس کی شدید لوڈشیڈنگ ہوگی۔ ''ساہنوں کی؟۔ ☆ پیپلز پارٹی کی حکومت نے کمیشن کھانے کے لئے گاڑیوں میں سی این جی چلانے کی اجازت ہی کیوں دی تھی۔ کیا انہیں معلوم نہیں تھا کہ گیس کے ملکی ذخائر اختتام پذیر ہیں؟ نیز ہمارے باورچی خانے میں تو گیس کم نہیں ہوئی۔ یہ عوام کے باورچی خانوں میں کام کرنے والی عورتوں اور فیکٹریوں سے بے روزگار ہونے والے مزدوروں کی ہماری حکومت کے خلاف ملی بھگت ہے''۔

☆ لاہور میں روزانہ دو کروڑ کے ڈاکے پڑتے ہیں۔ ''ساہنوں کی؟ اخبار والے جھوٹ لکھتے ہیں ابھی کل ہی ہمارے

ڈاکوؤں نے ہمیں حساب دیتے ہوئے بتلایا ہے کہ بڑی مشکل سے ڈیڑھ پونے دو کروڑ روزانہ بن رہا ہے''۔☆عمران خان ملک بند کرنے جارہے ہیں۔''ساہنوں کی؟ ہم اور ہمارے بچے ہیلی کوپٹر سے گھر چلے جایا کریں گے افسوس صرف یہ کہ منگلا بند، تربیلا بند، بجلی بند، گیس بند کے بعد''پاکستان بند'' کا تحفہ ہم نے دینا تھا مگر یہ کریڈٹ عمران خان لے اُڑے ہیں''۔☆ آئی ڈی پیز کھلے آسمان تلے سردیاں گزار رہے ہیں۔'' ساہنوں کی؟ ہمیں مخالفین سے یہ شکایت ہے کہ اگر اٹھارہ کروڑ لوگ بند کمروں میں رہ کر آکسیجن اور وٹامن ڈی کی کمی کا شکار ہو رہے ہیں تو کم از کم آئی ڈی پیز کو اگر اللہ نے ان بیماریوں سے بچنے کا موقع دے ہی دیا ہے تو اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت ہے''۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

ہم''ساہنوں کی؟'' کی اور بھی بہت ساری کامیابیوں کے گواہ ہیں۔ مثلاً آج شام مشاعرے میں کسی شاعر نے خوبصورت شعر پڑھا کہ''

میں اپنی مٹی خود گوندلایا ہوں
اب تم بنالو کوئی کھلونا اپنی مرضی کا

تو ہمارے منہ سے داد کی بجائے نکل گیا''ساہنوں کی؟''اس پر سامعین کو ہنسی کا دورہ جو پڑا تو شاعر صاحب یہ جا وہ جا۔ کل سراج الحق صاحب کی بات پر بھی ہمارے منہ سے یہی والے الفاظ نکل گئے جب انہوں نے عوام اور حکمرانوں کو یہ کہہ کر ڈرایا کہ''پاکستان کی بقا اسلامی نظام میں ہے''۔ بلکہ ہم بھی ڈر گئے ہوں گے یہ قیاس کر کے کہ وہ بقا والا اسلامی نظام صرف جماعت ہی کے قبضہ میں ہے۔اس''ساہنوں کی؟''والی بے حسی پر بیگم صاحبہ نے ناک بھوں چڑھا کے ہمیں متنبع کیا کہ خدا کا خوف کریں آپ بھی تو مسلمان ہیں ہم نے اس پر بھی جب''ساہنوں کی؟''کا نعرہ لگا کر جان چھڑانے کی کوشش کی تو بیگم نے بھی کوسنے والے انداز میں با آواز بلند یہ کہہ دیا کہ''ساہنوں کی؟ آپے اللہ وبخ لے گا''۔ قارئین اب آپ ہی ہمیں بتلائیں کہ''ساہنوں کی؟''کہہ کر ہم اگر وقت کے جبر کا مقابلہ نہ کریں تو کیا ہم اس شعر کی مانند نہ ہو جائیں گے؟

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

سُسرال سے چترال تک

ہمیں کمپنی کی جانب سے چترال جانے کا حکم ہوا تو جیسے رونگٹے سے کھڑے ہو گئے۔ نجانے کیوں خوف سا پیدا ہو گیا کہ اللہ میاں کے پچھواڑے جا کر کوئی لوٹا ہے بھلا۔ رہ رہ کر فیض کے ایک خوبصورت شعر کی پیروڈی ہمارے ذہن میں رینگنے لگی۔

؎ جو کوئے سسرال سے نکلے تو سوئے چترال چلے

مرتے کیا نہ کرتے تیاری پکڑ لی سسرالیوں نے ایک الوداعی کھانا بھی دے ڈالا۔ ہم کھانے کے دوران ہر برتن اور اردگرد کی چیزوں کو یوں دیکھتے رہے کہ جیسے آخری بار دیکھ رہے ہوں۔ بیگم کو مدتوں بعد ذرا غور سے دیکھ کر سوچا کہ ہمارے بعد اس بے چاری کا کیا بنے گا؟ دفعتاً چھوٹی بیٹی بھاگتی ہوئے پاس سے گزری تو ہم نے بے خیالی میں لپک کر اس کو سینے سے لگا کر یوں بوسے لئے کہ شاید یہ موقع پھر نصیب میں ہو کہ نہ ہو۔

اگلے روز دفتر سے چھٹی لے لی تا کہ کچھ تیاری کر لی جائے بہت سے کام سمیٹنے میں وقت لگ گیا۔ دل میں یہی خیال جاگزین رہا کہ ان سب چیزوں کی اہمیت تو ہمارے دم سے ہی ہے بعد میں کسی کے لئے ہماری وہ تمام چیزیں بے کار ہو جائیں گی جن کی نسبت محض ہم سے ہی ہے۔ ایک دفعہ تو خیال گزرا کہ بیٹے کو لیپ ٹاپ میں موجود اپنی سب سے خفیہ مالیاتی فائل کا پاس ورڈ بتا دیں اور تاکید کر دیں کہ جن جن سے پیسہ لینا ہے اُن سب کو معاف کر دینا اور جن جن کا دینا ہے ان کو فوراً لوٹا دینا۔

روانگی سے ایک شام قبل گھر میں بیٹا سفر کا سامان اکٹھا کر رہا تھا قریب سے بیگم گزریں تو انہوں نے نہایت نرمی سے چائے کا پوچھا ہمارا دل بھر آیا کہ شاید ان کو بھی ہماری واپسی کی اُمید نہیں رہی۔ اس خیال نے چترال کے سفر کا خوف دُگنا کر دیا اور ہمیں یقین سا ہونے لگا کہ ہمارے اردگرد لوگوں کو بھی ہمارے چل چلاؤ کا پتہ چل گیا ہے۔ بڑی بیٹی کئی دنوں سے یونیورسٹی میں خرچے گئے تین ہزار کا مطالبہ کر رہی تھی بٹوے میں موجود رقم پرنم آنکھوں سے اس کے حوالے کر دی اس نے بھی شاید زندگی میں پہلی بار شکریہ کا لفظ بولا تو ہمیں یوں لگا کہ یہ اس نے ہم سے آخری دفعہ بولا ہے۔

رات بارہ بجے کے لگ بھگ بال کالے کئے یہ سوچ کر کہ جب تک دم ہے ذوالفقار علی بھٹو کی طرح جوان نظر آئیں۔ خواہش یہ رہی ہو گی کہ اگر چترالی راستوں میں کھو کر واپس نہ آ سکے اور کہیں اور جا پہنچے تو لوگ یہی سمجھتے رہیں کہا بھی ڈاکٹر بیچارے کی عمر ہی کیا تھی؟ نیند بھی کیا ظالم چیز ہے کہ اپنے لاہور والے گھر کی آخری رات (سفر کے حوالے سے) میں بھی آ دھمکی اور بقول بیگم ہم نے خراٹے بھی خوب لئے تھے صبح ساڑھے سات بجے ڈرائیور کا فون آیا تو دل سے گہری خواہش ابھری کہ شاید ظالم یہی کہہ دے کہ صاحب دورہ کینسل ہو گیا ہے مگر وہ بھی دشمن جان وقت پر آن حاضر ہوا

آخر کار ڈگمگاتے قدموں اور سہمی سہمی سی خاموشی سے پشاور کی جانب عازمِ سفر ہوئے۔ زبردست گاڑی اور خنک ماحول اس پر مستزاد موٹروے کا سفر اور ایک خاتون سوشیالوجسٹ کا ساتھ۔ لیکن ہمیں یہ سب چاشنیاں بھی اب پھیکی پھیکی سی لگ رہی تھیں اسی کشمکش و پیچ میں ہم پشاور بھی جا پہنچے مگر خواہش یہی رہی کہ چترال نہ ہی جائیں تو بہتر ہو اور کوئی بہانہ ایسا بن جائے کہ ہمیں واپس بیگم اور سسرال کے قدموں میں حاضر ہونے کا موقع مل جائے خیر اگلے دن صبح ہی صبح دل میں ماتم کرتے چترال کی جانب آخر چل ہی پڑے اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا پہلے اپر دیر ایک تیز ندی کے اوپر کچے پُل میں گاڑی جا دھنسی بُرا ہو بے شمار گاڑیوں کے بے شمار ڈرائیوروں کا کہ لمبی لائن بچانے کی خاطر سب ہماری مدد کو آدھمکے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے کوئی درجن سے زیادہ پٹھانوں نے ہماری نئی نویلی ڈبل کیبن کو یوں نکال باہر کیا جیسے مکھن سے بال نکالتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک اور مصیبت سے پالا آن پڑا۔ لواری ٹنل کے سامنے رُکی گاڑیوں کا سیلاب ایک خطرہ بن کر ابھرا۔ ہم بھی انتظار کی لائن میں لگ گئے جو نو گھنٹے تک پھیل کر ہمارے سابقہ خدشوں کو سچ ثابت کرتا رہا۔ ہم Omens یعنی کشف کے معاملات میں کو کہ کمزور ہو چکے ہیں لیکن لواری ٹنل کے منہ پر نو گھنٹے کے انتظار نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اب بھی بہتری اسی میں ہے کہ واپس چل کر سسرال کے قدموں میں زندگی بسر کر لی جائے۔ لیکن ہمسفر خاتون کے صبر و تحمل سے سیٹ میں دھنسے رہنے اور بغیر آہ و بکا کئے ثابت قدمی نے ہمیں خاصہ شرمندہ کیے رکھا کئی بار سوچا کہ موت سے بچنے کے لئے تھوڑی سی بے شرمی کر ہی لی جائے۔ لیکن پھر خیال آتا کہ آدھے سے زائد سفر کر چکنے کے بعد تو کوئی بہانہ اب واپس جانے کا جچتا نہیں۔

رات ڈھائی بجے چترال پہنچ کر نواب آف چترال کے ہوٹل میں جھپاک سے بستر کی پناہوں میں چلے گئے۔ اگلی صبح سورج کی اولین کرنوں نے جب ترچمیر کی برف پوش خوبصورت چوٹی کو پہلے سنہری اور پھر چمکدار سفید بنا دیا تو ہمیں پہلی بار خوشی ہوئی کہ چلو اگر یہاں موت آ بھی گئی تو جنت ہی میں رہیں گے۔ چند لمحوں کے لئے اپنی قبل از چترالی زندگی کے بعد ترچمیری جنت کے حوالے کئے جانے پر حیرت ضرور ہوئی لیکن اس وقت سارے وسوسے ایک گہری خوشی میں ڈھل گئے جب ایک تیکھے نقوش والی انتہائی حسین چترالی بچی سکول یونیفارم میں پاس سے گزری ایک لمحے کے لیے اُس کی گہری نیلی جھیل جیسی آنکھوں کی گہرائی میں ہم نے ڈبکی کھائی تو پھر ذرا سنبھل کر کھڑے ہو گئے۔ گمان گزرا کہ ہم واقعی جنت میں پہنچ چکے ہیں اور بس ان بچیوں کے بعد وعدے والی حوریں بس کسی بھی لمحے آنے والی ہیں ہم نے تیاری کے طور پر اپنی عینک صاف کی مصنوعی لٹوں کو ترتیب دی، کالی شرٹ کے بازو پر لگی مٹی جھاڑی، بوٹوں کو ٹشو پیپر سے صاف کیا اور اس امید سے دوبارہ برفانی چوٹی پر نظریں گاڑھ لیں کہ بس کسی بھی لمحے وہاں سے دودھ کی نہریں، پریوں کی قطاریں اور تر و تازہ میوے برآمد ہونے ہی والے ہیں۔

ہماری گاڑی ناہموار پہاڑی راستوں پر پھدکتی رہی ہم جنت کے باغات اور اس کے حُسن میں کھوئے جاتے رہے ندی نالوں کے شور اور دریا کی ناگن جیسی چال کو لمحہ بہ لمحہ سینکڑوں تصویروں کی شکل میں کیمرے کی سکرین پر ریکارڈ کرتے رہے۔ کبھی درختوں کی لمبائی کے حُسن میں گر جاتے، کبھی نیلے پانی والے دریا کی لہروں کی دلفریبی میں کھو جاتے، کبھی راہ چلتی حسین بچیوں کی ماؤں کے حُسن کا اندازہ لگانے کی ناکام کوشش کرتے رہتے اور کبھی یہ سوچ کر دل

محسوس لیتے کہ جوانی میں یہاں کیوں نہ آئے اور یہیں کے کیوں نہ ہو رہے؟ احمد ندیم قاسمی کا مصرعہ لبوں پر پھیلتا رہا کہ

حسنِ انساں سے نمٹ لوں تو وہاں تک دیکھوں

مرد بھی بیچارا کتنا لاچار اور مجبور ہے اپنی خواہشات کے ہاتھوں مجبور ہے اسے ہر حُسن سے افضل جو حُسن لگتا ہے وہ اسکے لئے جنس مخالف کا حُسن ہے پر یوں جیسے نقوش پر فدا ہوتے ہوئے یہ بھی نہیں دیکھتا کہ اس کی اپنی شکل کسی بھدے سے جن سے قطعاً مختلف نہیں۔ ''دل ہے کہ مانتا ہی نہیں''۔ اب ہم چترال میں یوں کھو چلے تھے کہ جیسے سُسرال والے سب سو گئے ہوں۔ اب چترال کا جادو سسرال کی محبتوں کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

سوچتا ہوں کہ دنیا میں بھی اگر یہ انسان اس دنیا کو سسرال اور اگلے جہان کو چترال سمجھ لے۔ اور جانے سے نہ ڈرے۔ تو بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگ جاتی ہے۔ اگر ایک دفعہ ایسا کر کے دیکھ لے۔ تو یقین کریں پھر دوبارہ سسرال آنے کا کبھی بھی نہ سوچے۔ مثبت نکتہ نگاہ سے دیکھیں تو اسی کو شائد انسان کی افتادِ طبع سمجھا جاتا ہے جب تک وہ سسرال میں رہتا ہے تو چترال جانے سے ڈرتا رہتا ہے اور اگر چترال چلا جائے تو پھر وہاں سے واپس آنے کو اس کا دل نہیں چاہتا۔

جذباتی لوگ

ایک بار ہم نے ازراہ تفنن کہا کہ مشتاق احمد یوسفی ہمارے گھر نہیں آ سکتے کیونکہ انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ انہیں تین چیزوں سے سخت نفرت ہے یعنی جذباتی مرد، غیر جذباتی عورت اور کافی اور خوش قسمتی سے یہ تینوں چیزیں ہمارے ہاں عام ہیں۔ ہم ایک جذباتی قوم ہونے کے ناطے سے خود کو بڑے فخر سے محبِ وطن پاکستانی سمجھتے ہیں کیونکہ ہم جیسے لوگوں سے مل کر ہی ہماری قوم بنی ہے۔ ہم نے کئی بار پوری کی پوری قوم کو جذباتی ہوتے دیکھا ہے اور پھر نتیجے کے طور پر اجتماعی سزائیں بھی بھگتتے دیکھا ہے لیکن ہماری طرح کئی ایسے مواقع پر بھی قوم نے جذبات دکھا دیئے جن پر جذباتی ہونے کی قطعاً ضرورت نہ تھی اور اکثر اوقات ہم نے پوری قوم کو ان معاملات پر سوتے یا خاموش دیکھا ہے کہ جہاں بولنے کا موقع تھا۔

گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا

آیئے چند مثالیں دیکھیں۔ ایک بار ہم ٹی ٹونٹی کے فائنل میں بھارت سے ہار گئے۔ ساری قوم جذباتی ہوگئی کچھ جذباتی تماشائی تو آپس میں بھڑ بھی گئے کئی ایک نے اپنے ٹی وی توڑ دیئے اور کئی کمزور دل ہسپتال پہنچ گئے اس پر ہمیں اپنے سکول کے ایک کلاس فیلو مسٹر غلام رسول یاد آ گئے۔ جن کو بے حد جذباتی تقاریر کرنے کی بنا پر سکول بھر میں ''جذباتی صاحب'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ ایک بار انہوں نے بھٹو صاحب کے حق میں اس قدر دھواں دار تقریر فرمائی کہ حاضرین میں سے بہت سوں نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا اور بیچارے کئی روز اپنا انگ انگ ٹکور کراتے رہے۔ ہمارا بھی جی چاہا کہ میچ ہارنے کے بعد والی ان حرکات کے بعد اس جذباتی قوم کے ساتھ بھی جذباتی صاحب جیسا سلوک کیا جائے تو کیسا رہے؟

ایک بار ایسا ہوا کہ خانہ کعبہ پر قبضے کا سنتے ہی پوری قوم پھر جذباتی ہوگئی اور لاہور میں امریکن سنٹر کو آگ لگا دی جس پر امریکہ نے پاکستان کی امداد بند کر دی۔ معلوم نہیں کس نے انہیں جذباتی کر دیا تھا حالانکہ سوچنے کی بات تھی کہ امریکنوں کا قبضہ ایک شاہی خاندان پر ہے اس شاہی خاندان کا قبضہ پورے ملک پر اور ملک کا قبضہ خانہ کعبہ پر۔ لہٰذا امریکن سنٹر کو آگ لگانا محض سیاسی تماشہ ہوسکتا ہے یا پھر خود امریکی شوشہ البتہ سزا یہ ملی کہ امریکہ کو پاکستان کی امداد بند کرنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ بہر حال یہ ایک الگ بات تھی کہ ایک سیاسی جماعت کو امریکہ ہی کی فرمائش پر امریکہ کی مخالفت کر کے امریکہ زدگی کا طعنہ دھونے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔

پھر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ افغانستان پر روس نے چڑھائی کر دی یہ بات امریکہ بہادر کو پسند نہ آئی۔ لہٰذا امریکہ بہادر نے اسی مقصد کے لیے پیشگی طور پر اپنے لائے گئے جرنیل ضیاالحق کے ذریعے ساری قوم کو اس قدر جذباتی کر دیا کہ

سب نے مار مار کر روس کے آٹھ ٹکڑے کر دیئے اس پر ہماری قوم کو شاباش کے طور پر تین سزائیں تحفتاً ملیں جن کو ہم آج بھی سینے سے لگائے بیٹھے ہیں یعنی افغان مہاجرین، کلاشنکوف اور ہیروئین ۔ گویا اس بار بھی جذبات دکھانے کے نتیجے میں سزا ہمیں ہی ملی ۔

اس طرز کے بے شمار واقعات ہمیں یاد ہیں جن کو سپردِ قلم کرنے کے بعد شاید کتاب چھپوانی پڑ جائے لیکن ہم ایسا اس لئے نہیں کرنا چاہ رہے کیونکہ ہماری لکھی کتاب تو ردی میں چلے جانے کا زیادہ اندیشہ ہے یہ کونسا جنرل مشرف یا ملالہ کی کتاب ہے جس کے بہانے ہم پر کوئی کروڑوں ڈالر نچھاور کر دے گا ۔

اچھا جس طرح ہم اپنے گھر میں جذباتی ہیں اور ان معاملوں پر پیچ و تاب کھا جاتے ہیں جن کو باآسانی تدبر کے ساتھ نظر انداز کیا جا سکتا ہے ۔ اسی طرح ہماری قوم پر ہمیں فخر ہے کہ وہ بھی ہمارے ہی نقشِ قدم پر چلتے ہوئے جذبات کو ہمیشہ عقل پر ترجیح دیتی چلی آ رہی ہے مثال کے طور پر اگر ہم بھارت سے کھیل کے میدان میں ہار برداشت کر لیں تو کیا ہمیں قبض ہو جائے گی؟ یا امریکن سنٹر کو نہ جلانے سے ہماری ضمانت ضبط ہو جانے کا اندیشہ ہوگا؟ یا پھر اسلام کے اصل محافظ امریکہ بہادر کی جنگ کو اپنی جنگ سمجھ کر کہیں ہمیں غربت سے نجات مل جانے کا خطرہ ہوگا؟ بات دراصل یہ ہے کہ جس طرح طوطے نے سردار جی کو جذباتی کر دیا تھا اور نتیجتاً دونوں کو اڑتے جہاز سے باہر پھینک دیا گیا تھا اسی طرح کچھ مخصوص لیڈر اور مذہبی جماعتیں ہمیں ورغلا کر خود پیسہ بنا لیتی ہیں اور جب عوام بھوکا مرنے لگتی ہے تو تمسخر اڑانے کے انداز میں کہتی ہیں کہ "سردار جی اُڈ نائیں سی اوندا تے پنگا کیوں لیا سی (یعنی سردار جی اگر اڑنا نہیں آتا تھا تو پھڈا کیوں مول لیا تھا)۔ اس وقت ہمارے قائدین ہمیں دین سے دوری کا طعنہ دے دیتے ہیں ۔ بھٹو صاحب کو بھی شاید اسی لئے پھانسی کا تختہ ملا کیوں کہ انہوں نے ساری قوم کو جذباتی تو کر دیا تھا لیکن بدقسمتی سے خود بھی جذباتی ہو گئے تھے ۔

ذرا ایک دوسرے رُخ سے دیکھیں تو مذہبی جماعتوں کی کاروائی شاید زیادہ واضح طور پر نظر آ جائے ۔ مثال کے طور پر روزانہ کی بنیاد پر ڈاکے، قتل، بے روزگاری اور مہنگائی پر عوام ذرا بھی جذباتی نہیں ہوتے کیونکہ یہ باتیں مذہبی و سیاسی جماعتوں کی ترجیحات میں شامل نہیں ہیں ۔ ماسوائے حالیہ واقعۂ پشاور پر کہ جس پر ہر کسی نے جذبات دکھا دکھا کر اپنا فرض تو ادا کر دیا ہے ۔ لیکن آئندہ سے ایسے واقعات کی روک تھام کا کوئی میکنزم وضع نہیں کیا ۔ ہم نے محض دو روز کے دوران ایک اخبار کے دو صفحات سے دس ایسی خبریں اکٹھی کی ہیں کہ جن پر حقیقتاً ہمیں جذباتی ہو جانا چاہیے ۔ لیکن شومئی قسمت سے ان پر نہ تو قوم جذباتی ہو سکی نہ سیاسی و مذہبی و لسانی جماعتیں نہ این جی اوز، نہ حکومت، نہ عدالتیں، نہ میڈیا اور نہ ہم خود ۔ ذرا ملاحظہ کریں ۔

☆ بھتہ خوری سمیت جرائم کی شرح میں خطرناک اضافہ، روزانہ دو کروڑ کے ڈاکے ۔ ☆ پولیس ذہنی مریض کو چوری کے شبہ میں کئی روز بجلی کے جھٹکے دیتی رہی ۔ ☆ نماز جمعہ کے دوران مساجد اور امام بارگاہوں کی سکیورٹی انتہائی سخت ۔ ☆ مصری شاہ میں دو روز میں گیارہ سیوریج دھماکے، دو گھروں کی دیواریں بھی گر گئیں ۔ ☆ محبت کی شادی کرنے والی بہن سے بھائیوں کی اجتماعی زیادتی ۔ ☆ جھنگ میں صلح کی خاطر سات سالہ بچی کو ونی کر کے گیارہ سالہ دولہے کے ساتھ رخصت کر دیا گیا ۔ ☆ لیاقت آباد میں گھریلو جھگڑے پر تاجر رہنما کے بیٹے نے خودکشی کر لی ۔ ☆ تھر میں تین سو بچے

بھوک سے مر گئے ۔☆ اٹھانوے سالہ پرانے اراضی کے مقدمے کا فیصلہ تیس دن میں کرنے کی ہدایت ۔☆ گڈانی جیل کے قیدی پر پیٹ سے تین موبائل فون نکالتے ہوئے بے ہوشی کے دورے ۔وغیرہ ۔

ہمارا خیال ہے کہ ہم خود سے جذباتی نہیں ہوتے اور مزے سے بے حسی کے مزے لوٹتے رہتے ہیں یہ تو بھلا ہو چند لیڈروں کا جو ہمیں جذباتی کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں لیکن ان کا اپنا ایجنڈا ہوتا ہے اور ان کو عوام سے کچھ ایسا سروکار بھی نہیں ہوتا ۔دشمن کے لیے اچھا موقع ہے اور وہ محض ہمیں جذباتی کرکے ہی اپنے مقاصد پورے کرسکتا ہے بھارت سمیت ہمارے متعدد دشمن خوامخواہ ایٹم بم اور آبدوزیں بنا کر وقت اور پیسہ برباد کررہے ہیں وہ صرف دو تین کام کرتے رہیں تو یقین کریں ہم خود ہی تباہ و برباد ہو کر انہیں دکھادیں گے مثلاً بھارت کرکٹ اور ہاکی کی مضبوط ترین ٹیم بنالیں اور ہمیں مسلسل ہراتے رہیں تو ہم خود ہی اپنے شیشے وغیرہ توڑتے رہیں گے ۔دوم کبھی کبھار وہ ہمارے مذہبی تقدس کی بے حرمتی کردیا کریں تو ہم ہڑتالیں وغیرہ کرکے اپنے کاروبار برباد کرلیں گے ۔سوم ہمارے دشمن سالانہ صرف ایک آدھ بار کسی خوبرو فلمی حسینہ کو لاہور، کراچی کا دورہ کراتے رہیں تو ہم انشاءاللہ جھوم جھوم کے ہی صبح کو شام کرتے رہیں گے اور خود ہی نہ صرف شہید ہونے پر تیار ہوجائیں گے بلکہ کسی بلڈنگ، گاڑی و سفارتخانے کو اس قابل نہ چھوڑیں گے کہ مستقبل کی کسی بھی تحقیق سے یہ پتہ چل سکے کہ قومیں کس طرح اپنی موت آپ مرتی ہیں ۔اب اپوزیشن کی جوابی اننگ کے لئے دونوں ٹیمیں اگلے برس پاکستان کے اتفاق محلات کا دورہ کریں گی ۔

حکومتی الیون کے ہزاروں رنز کا جواب دینے کے لئے اپوزیشن الیون کے زرداری اور الطاف حسین اوپننگ کے لئے آئے ہیں ۔حکومتی الیون کے عالمی شہرت یافتہ باولرز رانا ثناء، نثار احمد، ایاز صادق، ڈاکٹر مالک و افتخار چوہدری وغیرہ نے اپوزیشن الیون کا بھرکس نکال کے رکھ دیا ہے ۔ایک موقع پر تو یہ لگ رہا تھا کہ اپوزیشن شاید ایک رن بھی نہ بنا پائے لیکن ان کی پوری ٹیم بہر حال جان توڑ محنت کے بعد محض نو رن بنا کر آوٹ ہوگئی اور یوں یہ میچ حکومتی الیون نے ہزاروں رنز سے جیت لیا ہے ۔

آئی سی سی کے ساتوں غیر جانبدار ایمپائرز سے مشورہ لے کر حکومتی الیون کو ورلڈ رینکنگ میں پہلے نمبر پر قرار دے دیا گیا ہے اور چونکہ باقی دنیا بھر کی ڈرپوک ٹیمیں ترقیاتی کاموں کا بہانہ لگا کر شامل نہیں تھیں اس لئے اپوزیشن الیون کو دو نمبر قرار دے دیا گیا ہے ۔ایمپائرز کمیٹی میں شامل گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ والوں نے اعلان کیا ہے کہ ڈاکٹر نواز شریف دنیا کے پہلے بیٹسمین وزیر اعظم ہیں اور رانا ثناءاللہ کو باونگ میں پہلا نمبر عطا کیا گیا ہے ان کامیاب ترین سیاسی لیڈروں کی حوصلہ افزائی کے لیے یہ اضافی اعلان کیا گیا ہے کہ جب تک یہ حضرات زندہ رہیں گے ہر سال عالمی کتاب میں ان کے نام درج کئے جاتے رہیں گے ۔ڈاکٹر نواز شریف کو ایک اور اضافی اعزاز یہ بھی دیا گیا ہے کہ ایک موقع پر جب بلاول زخمی ہو کر گرے تھے تو انہوں نے ڈاکٹر کا رول ادا کرتے ہوئے ان کی مرہم پٹی بھی کردی تھی یہ انسانیت کی معراج ہے ۔

بھارتی میڈیا پاکستان کرکٹ ٹیم کی یہ نیک نامی برداشت نہیں کرپا رہا ہے اور مسلسل اعتراض کررہا ہے کہ حکومتی اور اپوزیشن ارکان پارلیمان کا مذکورہ میچ فکس تھا جس میں دنیا کے بڑے بڑے اور پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے کی

قیمت لگادی گئی تھی مگر سب کومعلوم ہے کہ جل کر اور ہار کر الزام لگانے والے کی بات میں کوئی وزن نہیں ہوتا۔

ایک بار پھر غیر ملکی حملہ

حضرت شیخ ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کو اپنے سابقہ الہامی و وجدانی بیانات کا اس قدر پاس ہے
کہ جب وہ ۶۳ برس کی عمر میں اپنے خواب کے مطابق وفات پا کر اس دنیا سے منہ نہ موڑ سکے تو انہوں نے ایک غیرت
مند اور وضعدار انسان ہونے کے ناطے پاکستان سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو غیر ملکی بنا لیا اور کینیڈا کی شہریت اختیار کر
لی۔اب یہ زندہ پیر اللہ سے روابط و تعلقات توڑے بغیر غافل پاکستانیوں کو شرمندہ کرنے کے لئے پھر سے جلوہ گر ہو گئے
ہیں۔ہمیں غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کے لئے نیز مہنگائی و بدامنی وغیرہ کی ظالم زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے
شدید محنت کے لئے پر تول رہے ہیں تا کہ مطلوبہ مقاصد کم از کم ایک ماہ کے دوران حاصل کر لیں۔

شیخ الاسلام کو بار بار نا قدرے صحافی ۳۶ برس گزر جانے کے باوجود وفات نہ پانے پر طنز کرنے
سے باز نہیں آتے حالانکہ ان بے وقعت دنیاداروں کو بھلا اللہ کے حساب کتاب کا کیا پتا؟ ترسیٹھ برس تو ایک علامت بھی
ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف سے ایک سو ترسیٹھ برس بھی طویل بھی ہو سکتی ہے۔بلکہ ہمیں تو لگتا ہے کہ ۶۳ نوری سال بھی ہو
سکتی ہے۔یہ تو اعلیٰ حضرت جناب شیخ الاسلام کی حبِ رسول کی ایک ادنیٰ سی خواہش تھی کہ کاش ان کی عمر حضور اکرم ﷺ
کی عمر سے زائد نہ ہو پائے۔دراصل جو کچھ سوچتا ہے یا چشمِ تماشا سے جو کچھ اس کے حافظے میں اترتا ہے وہی کچھ خواب
کی شکل میں نیند میں دکھائی دیتا رہتا ہے۔قبلہ طاہر صاحب کوئی ہم جیسے عام انسان تھوڑی ہیں کہ خواہش کو خوابوں میں نہ لا
پائیں۔وہ تو اکثر سچے خواب بھی دیکھنے اور بننے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں۔ہو سکتا ہے کہ انہوں نے میڈیا کا کچھ طنزیہ
دباؤ دل پر لے لیا ہو اور اسلاف کا ملک پاکستان چھوڑ کر دیارِ عیسائیاں میں جا بسے ہوں۔ہمیں تو بہر حال یقین ہے کہ وہ
کینیڈا کی صاف ستھری فضاؤں میں طوعاً کرہاً ہی جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہوں گے اور اس اجڑ پاکستانی قوم کا علاج
بھی یہی ہے کہ اس کے حقیقی رہنما دوسرے ملکوں میں بیٹھ کر انہیں کنٹرول کریں جیسے زرداری، نواز شریف، الطاف
حسین، مشرف وغیرہ۔

صحافت شائد اسی کو کہتے ہوں گے کہ کوئی بات کا بتنگڑ بنانے کا کس قدر ماہر ہے۔بعض موئے بلکہ
کلموئے صحافیوں نے تو یہاں تک لکھ مارا ہے کی قبلہ شیخ الاسلام کے نوے ممالک میں موجود لاکھوں قدر دانوں کے
بھجوائے گئے کروڑوں ڈالروں کا بوجھ سٹیٹ بنک آف پاکستان اٹھانے کے قابل نہ تھا اس لیئے انہوں نے یہ عظیم ذمے
داری جان بوجھ کر کینیڈا کے بنکوں کے ناتواں کندھوں پر ڈال دی ہے۔نیز وہاں ایک اضافی فائدہ بھی ہوا ہے کہ وہ ڈالر
ضبط نہیں کرتے۔رفاہی کاموں پر ٹیکس نہیں لیتے بلکہ سب سے بڑھ کر یہ خوبی بھی ان میں موجود ہے کہ حساب مانگنے
والے موئے پاکستانیوں کو منہ نہیں لگاتے۔حضرت کے جدی ملک پاکستان کا تو یہ حال ہے کہ یہاں اس زندہ دلی اور عظیم

شیخ الحدیث کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر عدالتوں سے انصاف تک نہیں لینے دیا جاتا۔ احمق مخالفین ان حقائق کو کیا جانیں۔ عین ممکن ہے کہ انہی مجبوریوں کی وجہ سے ان کو عظیم فرزند افغانستان حضرت باچہ خان یعنی عبدالغفار خان مرحوم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس بے انصاف جدی ملک پاکستان میں دفن ہونے پر اعتراض ہو۔ اور جس طرح خان صاحب کی قبر مبارک ہندوؤں کے حمایت یافتہ و روسی کمیونسٹوں کے دیس افغانستان میں ہے۔ یا جس طرح جناب حضرت مولانا محمد علی جوہر کی مرقد عیسائیوں کے ازاد ملک برطانیہ کے گورے قبرستان میں ہے۔ ویسے ہی حضرت شیخ الحدیث اور شیخ السنّت نیز اکیسویں صدی کے عظیم سپوت اسلام جناب طاہر القادری صاحب نے بھی فیصلہ کیا ہو کہ جس ملک کے ایماندار سیاستدانوں کے پاجامے محض اس جرم کی پاداش میں لیک کرنے کی سازشیں کی جاتی ہوں کہ وہ اس فضول دولت کو ملک سے باہر نہ لے جاسکیں جو غریبوں کے کام کی بھی نہیں۔ اس ذہنی غلام اور بے انصاف ملک سے کیوں نہ خود بخود جلاوطنی اختیار کر لی جائے۔ نیز اگر اپنی دولت پر ٹیکس دے کر محض بیوروکریسی ہی کو پالنا ہے تو کیوں نہ یہ ٹیکس صحیح مصرف میں لانے والے ملک کینیڈا کے حوالے کر کے کچھ فالتو مراعات ہی لے لی جائیں۔ ہم پوری طرح سے متفق ہیں کہ حضور قبلہ طاہر القادری صاحب کے ان تمام حفاظتی اقدامات کی بے شمار شرعی وجوہات ہیں۔ جو اگر قرآن سے ثابت نہ بھی ہوسکیں تو ان بے شمار احادیث سے ثابت ہو جائیں گی جو ان کے فرقہ عالیہ کی ساتویں کتاب الحدیث میں نہایت احتیاط سے درج کرادی گئیں ہیں۔

اب کینیڈا کی شہریت اختیار کر لینا بھی بھلا کوئی قابل اعتراض یا غیر شرعی قدم ہے؟ اگر ہم حاصل نہیں کر پائے تو اس میں جناب عظیم المرتبت طاہر القادری صاحب کا کیا قصور ہے۔ ہمارے ساتھ دراصل کچھ یوں ہوا کہ ہمارے یورپ کے عرصہ قیام میں امریکن بایوگرافک انسٹی ٹیوٹ (اے بی آئی) نے کہیں سے ہمارا پتا حاصل کر کے محض تین سو ڈالر کے عوض ایک ایسا ایوارڈ کمپیوٹر سے پرنٹ کر کے عطا کرنے کا وعدہ کیا کہ جس کو فخر سے کہیں بھی پیش کیا جاسکتا تھا۔ ہماری جیبی غربت کے ساتھ ساتھ ذہنی غربت نے اس عظیم آفر کو قبول نہ کر کے اپنی امریکن یا کینیڈین شہریت کے کیس کو خاصہ گھمبیر کر دیا۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر حضرت صاحب کے کسی معتقد خاص نے محض دس ہزار ڈالر کے عوض اس طرح کے پینتیس ایوارڈ عقیدتاً خرید کر آنجناب کی کینیڈین شہریت آسان بنادی ہو تو اس معمولی واقعے پر جلنے یا بھننے کی کیا ضرورت ہے۔ لاہور کی گرمی ہمارا جسم جلائے اور ۱۳۵ اسناد خون جلائیں تو اس سے حضرت صاحب کا کیا جاتا ہے۔ ان ناکامیوں پر ہم جل جل کر چاہے مزید کالے ہوتے چلے جائیں مگر اللہ کی خاص مہربانیوں اور اسلاف کی برکتوں سے قبلہ حضور سرخ و سپید اور ٹھنڈے ٹھار رہیں گے۔ جلنے والے کا منہ کالا۔

ہمارے جگ حسد ساتھی ڈاکٹر خطائی نے جناب شیخ الاسلام صاحب کے حالیہ دورۂ پاکستان کو بھی زہریلی نگاہوں سے گھورتے ہوئے یہ طنزیہ تیر چلا دیا ہے کہ شیخ صاحب نے ہر سال کی طرح اس سال بھی اس غریب ملک کے نادار عوام پر پھر سے غیر ملکی حملہ کر دیا ہے۔ دیکھیں بھائی اس قدر جلنے کا تو فائدہ کچھ نہیں۔ قائد تحریک کوئی امریکن ڈرون تھوڑی ہیں کہ معتقدین کی عقیدت کا امتحان لینے کیلئے لاہور یا اسلام آباد کی گرما گرم زمین پر دھرنا دیے ہوئے مریدوں پر جا گریں۔ اور مقصد حاصل ہوتے ہی دوبارہ کینیڈا کی ٹھنڈی ٹھار فضاؤں میں جا بسیں۔ حسدین کو چاہیے کہ

ذراصبر کی چھری کے نیچے دم لیں۔ کیونکہ اس بار بھی معاملہ کچھ خاص قسم کا لگتا ہے۔ ورنہ اس گرم موسم میں سرد ملک چھوڑ کر گرما گرم پاناما لیکس والے جدی ملک پاکستان میں اپنے مریدوں کو تکلیف دینے کون آتا ہے۔ یقیناً اس تکلف کے پیچھے کچھ خاص الخاص حجتیں ہوں گی۔

ہمارا مشورہ ہے کہ جب تک مجدد حدیث قبلہ طاہر القادری صاحب مدظلہ علیہ اپنی زبان مبارک سے کوئی خواب یا دیگر ارشاد عالیہ یا حالیہ غیر ملکی دورہ پاکستان کے اغراض ومقصد خود نہ فرمادیں، تب تک ہرزہ سرائی کرنے والوں کی زبانیں بند رہنی چاہئیں۔ وگرنہ اسلام اور پاکستان کو پہنچنے والے ممکنہ نقصانات کے وہ خود ذمے دار ہونگے۔ پھر نہ کہنا خبر نہ ہوئی۔

بریکنگ نیوز

کسی زمانے میں ٹی وی پر بریکنگ نیوز نشر کرنے کا معیار یہ تھا کہ ایسا واقعہ سنایا جائے جس سے دنیا چونک جائے یا کم سے کم کوئی ایک ملک تو ضرور چونک پڑے۔اس زمانے میں بریکنگ نیوز کچھ اس طرح سے ہوا کرتی تھیں:۔

☆ بھارت کی وزیراعظم اندرا گاندھی کو گولی ماردی گئی۔☆ پاکستان کے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو فوجی جنتا نے پھانسی پر لٹکا دیا یا پھر روسی وزیرخارجہ گرومیو جنگ بچانے کے اچانک واشنگٹن پہنچ گئے وغیرہ وغیرہ۔اور آج کی نیوز کس درجہ کی ہوتی ہیں ذرا ملاحظہ کریں:۔

☆ کراچی کے علاقہ گلشن میں مسلسل بارشوں کے بعد سینکڑوں مینڈک ٹرٹراتے دیکھے گئے۔

☆ ناظرین حالیہ بارشوں سے شدید متاثرہ گلشن اقبال کراچی میں سینکڑوں مینڈک ٹرٹراتے ہوئے سڑکوں پر آ گئے۔

☆ ہمارے کیمرہ مین نے اطلاع دی ہے کہ سینکڑوں مینڈک ٹرٹراتے ہوئے سڑکوں پر آتے دیکھے گئے۔

☆ ایک بار پھر آپ کو بتاتے چلیں کہ سینکڑوں مینڈکوں کو گلشن اقبال کراچی کی سڑکوں پر ٹرٹراتے پایا گیا۔

☆ ناظرین ہمارے خصوصی نمائندہ نے گلشن اقبال کراچی سے خبر دی ہے کہ سینکڑوں مینڈک بارش کے بعد سڑکوں پر ٹرٹرانے لگے۔

☆ گلشن اقبال کراچی میں سینکڑوں مینڈکوں کے ٹرٹرانے کے سبب ٹریفک جام کے مناظر۔

☆ مینڈکوں کو ٹرٹراتے ہوئے سڑکوں پر دیکھا گیا ہے جونہی مزید مینڈک ٹرٹراتے ہوئے سڑکوں پر آئیں گے ہم آپ کو وہیں لے چلیں گے۔

اس بریکنگ نیوز کے بعد خصوصی اہتمام سے یہ بھی اعلان بھی کیا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں ہم نے سب سے پہلے یہ نیوز بریک کی ہے۔اس خبر کو دیکھ کر مینڈک بھی ششدر رہ گئے ہوں گے۔

میڈیا میں سبقت لے جانے کی کوشش میں کچھ یوں بھی بریکنگ نیوز نشر کی جاتی ہے:

☆ ساہیوال کے حجام ہاں بیک وقت چھ بچوں کی پیدائش۔☆ کالی بلی نے سفید بچوں کو جنم دیا۔☆ چیچو کی ملیاں میں عجیب الخلقت بچے کی پیدائش۔☆ اسلام آباد کے سیکٹر ایچ کے فلیٹ نمبر 10 اور 25 کے درمیان کرکٹ میچ ملتوی۔☆ ربعہ بازار میں پنکچر کی دکان میں پراسرار دھماکہ۔☆ دیوس روڈ پر پگڑی والوں کا ڈانس ☆ نسوار اور چونا بیچنے والوں نے خود بھی پان کھانا شروع کر دیا۔

مگر ایک بات تو طے ہے کہ ہم چونکیں نہ چونکیں دنیا ہماری بریکنگ نیوز کے معیار پر ضرور چونک پڑتی ہے۔دنیا بھر میں اس وقت بریکنگ نیوز کے معاملے میں گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ اندراج کے قریب قریب ہیں اس لئے زیادہ

چوکانے کے مقابلے میں ہم اگر کچھ ایسی خبروں کا اضافہ کرلیں تو جیت پکی ہے مثلاً ☆مولانا فضل الرحمان نے حق اور سچ کی خاطر جان دینے کا فیصلہ کرلیا ہے اور آئندہ وزارتوں پر مرنے کے بجائے مسرت شاہین پر مرا کریں گے۔☆مرزا منور حسن اب امریکہ اور بنگلادیش کے حالات پر کڑھنے پر کچھ وقفہ کیا کریں گے اور اس درمیانی وقفہ میں اسلام اور پاکستان کو بھی وقت دیا کریں گے۔☆شہباز شریف جوشِ خطابت میں مائیک توڑنے کے بجائے اب لاہور بھر کی سڑکیں توڑا کریں گے۔☆خواتین وحضرات عمران خان نے اپنی 62ویں سالگرہ پر جی ایچ کیو میں نوجوان قیادت کا سنگِ بنیاد رکھا۔☆نواز شریف عرصۂ دراز کے بعد پاکستان کے دورے پر تشریف لاتے ہی سب سے پہلے حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر حاضری دینے پہنچے اور ہم آپ کو مزید باخبر رکھنے کے لئے بتاتے چلیں کہ ''ناور کے علاقے میں ایک سائیکل سوار کی سائیکل کی چین اتر گئی جسے بڑی مشکل سے عوام کی مدد سے دوبارہ چڑھایا جاسکا''۔☆ناظرین ق لیگ نے بھی اخباروں کے صفحۂ اول پر رہنے کے لئے سرمایہ کاری کرنا شروع کردی ہے تاکہ عوام ان کے سابقہ کارناموں کو بھولنے کی جسارت نہ کرسکیں۔☆عامر لیاقت نے بہترین مقرر کا نوبل پرائز جیتتے ہی اب اپنی خوش الحانی کا جادو لاہور کے اسٹیج ڈراموں پر جگانا شروع کردیا ہے۔اور ناظرین یہ خبر بھی ہم نے سب سے پہلے بریک کررہے ہیں کہ اگر انڈہ صحیح طور پر نہ ابل سکے تو کوئی دوسرا انڈہ ابال لیں۔علیٰ ہذاالقیاس۔

ہم نے بریکنگ نیوز کی صنعت سے متاثر ہو کر ایک ٹی وی چینل کھولنے فیصلہ کرلیا ہے جس کا نام بی این ٹی وی ہوگا اس پر چوبیس گھنٹے صرف بریکنگ نیوز ہی نشر ہوں گی اور ہم یقین دلاتے ہیں کہ اس کے معیار کو ہمیشہ بلند رکھنے کے لئے سر دھڑ کی بازی اس بات پر لگادیں گے کہ اسے سنتے ہی اگر آپ کی ہنسی نہ چھوٹ جائے تو پیسے واپس۔آخر کسی چینل نے عوام کی بتیسی کی ورزش بھی تو کرانی ہے۔

انکل ماموں

ہمارے ایک پاکستانی دوست ڈار صاحب سے ستر سال کی عمر میں جب دوسری بیوی نے علیحدگی اختیار کی تو انہوں نے علی اعلان رونا شروع کر دیا۔ ہر آنے جانے والے سامنے وہ اس قدر آنسو بہاتے کہ مہمان بے چارہ ان کے کیلی فورنیا والے فلیٹ سے تقریباً پھسلتا ہوا اس طرح باہر نکلتا کہ پھر دوبارہ ملنے کا نام نہ لیتا۔ یوں وہ بے چارے دو بیویوں اور چار بچوں کی موجودگی کے باوجود دنیا میں ایک بار پھر سے اکیلے رہ گئے۔ پہلی بیوی نے ان کو دیگر خواتین میں دلچسپی کے باعث چھوڑا تھا دوسری نے امریکن پاسپورٹ ملتے ہی۔ حالانکہ دوسری کے باعث وہ تمام دوستوں سے چھٹ گئے تھے اور پھر یوں وہ بیک وقت اپنوں کے لئے اور اپنے ان کے لئے اجتماعی طور پر وفات پا گئے۔

پھر ایک دن انہوں نے اکیلے مرنے کے ڈر سے پاکستان کی فلائیٹ پکڑی غالباً یہ جان کر کہ امریکہ و یورپ کے مزے تو لوٹ چکے اب پاکستان چل کر بڑھاپے کی برکتیں سمیٹتے ہیں۔ یہاں آ کر انہوں نے اپنے ان تمام بہن بھائیوں اور دوستوں کی تلاش شروع کر دی جن کو وہ ستر کی دہائی میں اپنے تئیں موت کی نیند سلا کر امریکہ سدھارے تھے۔ چند ایک ان کو اکڑی ہوئی لاشوں کے مصداق مل بھی گئے مگر بے سود۔ آہستہ آہستہ ڈالروں کی شکل میں سوشل سکیورٹی کی طور پر ملنے والی موٹی رقم کے باعث ان کی ٹور بننے لگ گئی لیکن ان کا بے چین دل نہ بہن بھائیوں میں لگا نہ دوستوں میں۔ معلوم نہیں کیوں وہ ایک انہونا ٹھرک لئے لاہور کے ایک فلیٹ میں پالتو پرندوں کے جلو میں اکیلے رہنے لگے۔

ایک روز فزیوتھراپی کراتے کراتے انہیں ایک جواں سالہ یتیم عیسائی لڑکی پر اتنا ترس آیا کہ اس کو بھانجی مشہور کر کے گھر لے آئے۔ شاید انہوں نے حکیم اللہ وسایا کے دعویٰ کہ "مرد اور گھوڑا کبھی بوڑھے نہیں ہوتے" کو ویاگرا کے ذریعے آزمانے کا فیصلہ کرلیا تھا مگر لاہور لاہور ایہہ، لاس آنجلس نہیں۔ اس منہ بولی بھانجی کو اپنی شہرت ان انکل کے پچاس ہزار ماہانہ سے زیادہ عزیز تھی لہٰذا اس نے ہمیشہ راتیں اپنے ہوسٹل ہی میں گزاریں۔ دونوں کی اغراض کرشن چندر کے مشہور افسانے کے مصداق پوری رہی ہوتی رہی ہوں گی۔ بھانجی بے چاری کا خرچہ پانی اور ڈار صاحب کی ہانڈی روٹی کے ساتھ ساتھ گرل فرینڈ والا شوق بھی پورا ہوتا رہا ہوگا۔ بہر طور اب صورتحال یہ ہے کہ موصوفہ جہاں بھی نوکری کرنے جاتی ہیں کوئی نہ کوئی ڈیموا سے جونہی ڈسنے کی کوشش کرتا ہے تو فوراً انکل ماموں کسی رقیب روسیاہ کی مانند اس شہزادی کے پیچھے لٹھ لئے رقیبوں سے دنگل کرنے نکل جاتے ہیں۔ ڈار صاحب کسی امریکن پالیسی کی مانند مکمل طور پر کامیاب ہیں کیونکہ انہیں بڑھاپے میں جوانی والا سہارا مل گیا ہے لیکن گرل بھانجی کو یہ نقصان ہوا کہ بیچاری کی عمر دھیرے دھیرے کھسکنے لگی ہے اور ابھی تک نہ وہ کوئی منزل اور نہ کوئی مہارت حاصل کر پائی ہے کہ اس اسی سالہ زندہ لاش یعنی منہ بولے ماموں کے جسم خاکی کے تڑخنے سے پہلے کسی محفوظ محاذ پر مورچہ زن ہو سکے۔

ابھی ہم اتنا ہی لکھ پائے تھے کہ دماغ نے سوچنا بند کر دیا ہے اور سمجھ نہیں آ رہی کہ اس سچی کہانی کو کیسے طربیہ رنگ دیں۔ ہم اسی اُدھیڑ بن میں غلطاں تھے کہ کس طرح جھوٹ کے خوبصورت رنگ بکھیریں کہ قاری چند منٹوں کی ریڈنگ میں ٹھرک پوری کر لے۔ اسی دوران ہمارے ایک دوبئی پلٹ دوست کی نظر آج اس ادھوری تحریر پڑ گئی وہ بے ساختہ بول اٹھے کہ کالم کا رخ ''مامے مودے'' کی طرف موڑنا مقصد تو نہیں؟ ان کے مزاح نے بہر حال ایک اچھا کام یہ کیا ہے کہ ہمارے خیالات کو شدت سے بہنے کے لئے سمت میسر آ گئی ہے۔ لاہوری ہونے کے باوجود ہمیں آج تک یہ بات نہیں سمجھ آئی کہ اندرون لاہور کے لوگوں کی زبان پر ''ماما'' کا لفظ بطور گالی کیوں مروج ہے بس ہم نے مندرجہ بالا سچی داستان سے دو الفاظ یعنی ماما اور ٹھرک پر تحقیق کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

جونہی ہم نے اس لاہوری سلینگ پر تحقیق شروع کی ہے تو کئی واقعات یاد آ گئے ہیں۔ بچپن کے ایام کا ذکر ہے کہ والد صاحب نے روز افزوں اولاد اور مہنگائی سے تنگ آ کر آدھا گھر کسی دو بچیوں والی بیوہ استانی کو کرائے پر دے دیا۔ اس نے شاید بچیوں کے کسی ماموں سے درخواست کر رکھی تھی کہ روزانہ ان کی خبر گیری کرتا رہے۔ اس دور میں زمانہ ذرا زیادہ ظالم اور دوسروں پر نظر رکھنے والا تھا ہمارے ابا بھی محلے داروں کی باتوں میں آ گئے اور بے چاری بیوہ استانی سے زبردستی مکان خالی کرا لیا مگر ماموں اس کڑے وقت پر بھی بلائے گئے مگر نہیں آئے۔

ایک بار کسی فلم میں مرحوم منور ظریف نے اپنے ماموں کی ٹی سی کرتے ہوئے یہ نکتہ نکالا کہ ماموں ماں سے زیادہ پیارا ہوتا ہے کیونکہ دو دفعہ ماں کہیں تو ماما بنتا ہے اس پر کئی ایک ماموں تو پھولے نہیں سمائے ہوں گے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ لاہور میں بسنے والے بے شمار ماموؤں نے ضرور برا منایا ہوگا۔ مگر کس لئے یہ بات ابھی بھی سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وجہ یہ ہو کہ ہمارے پنجاب میں روایت ہے کہ مبارک معنی والے الفاظ کو بسا اوقات تمسخرانہ یا طنزیہ انداز میں بھی بیان کر دیا جاتا ہے جیسے کہ کلاس کے نالائق ترین بچے کو 'علامہ' محلے کے شرارتی بچے کو 'حضرت' اور مخنتی انسان کو 'ڈھگے' کے القابات سے نواز دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسی وجہ سے ظالم مخالفین نے مرحوم میاں طفیل محمد کو جنرل ضیاالحق کا 'ماما' ڈالا۔ بلکہ ابھی کل کی ہی بات ہے کہ جناب حافظ حسین احمد نے لاہور کے نارزن جناب گلو بٹ کو عمران خان کا ماموں کہ ڈالا ہے جبکہ ہمیں اختلاف ہے بھئی تحریکِ انصاف کے ماموں تو کوئی جرنیل صاحب تھے۔

جس طرح ماموں کے رشتے کو غلط مفہوم پہنا دیا گیا ہے ویسے ہی ٹھرک کو بھی جنسی معانی پہنا دیے گئے ہیں۔ لیکن لغوی اعتبار سے دیکھیں تو یہ شوق جیسے جذبے کی توہین کے طور پر گڑھا گیا لگتا ہے۔ اصل لفظ کو اگر پھبتی کے طور پر استعمال کریں تو بات کچھ یوں بنتی ہے کہ جیسے ہم کہیں کہ نئی نسل کو فیس بک کا ٹھرک اور پرانی نسل کو کڑھتے رہنے کا ٹھرک، سیم و زر کے سمندر میں غرق ہو جانے کے باوجود زرداری کو زردار بننے کا ٹھرک اور شریفوں کو پاور میں رہنے کا ٹھرک، عمران خان کو نیا پاکستان بنانے کا ٹھرک، اے این پی کو بڑے ترقیاتی منصوبوں کو برباد کرنے کا ٹھرک، ق لیگ کو ایسی سائیکل چلانے کا ٹھرک جس کے کتے بھی فیل ہو چکے ہوں۔ جنرل مشرف کو وردی جسم سے اتار کر ہاتھ میں پکڑے رکھنے کا ٹھرک ہے۔ تاجر طبقے کو بھارتی تجارتی بالادستی پر رونے دھونے کا ٹھرک اور ڈاکٹروں کو ہڑتال پر جانے کا ٹھرک اور انجینیئرز کو پل گرانے کا ٹھرک ہے۔ اس سب صورتحال میں کوئی پڑھے نہ پڑھے ہمیں لکھنے کا ٹھرک ہے، اب اگر کوئی منہ

بولی بھانجی کے انکل ماموں کو ماما بول دے تو اس کی زبان تھوڑی پکڑی جا سکتی ہے؟

ڈاکٹر سلطان محمود کی تصانیف

English Books	اردو کتب
Nutrition and Health غذا اور صحت	
4. Fundamental of Human Nutrition	۱۔ غذائی علاج (حصہ اول)
5. FDRC Bulletin 1997-2003	۲۔ غذائی علاج (حصہ دوم)
6. FDRC Bulletin 2007-2009	۳۔ غذائی بلیٹن 1997-2003
Environment and Food Security ماحولیات اور غذائی تحفظ	
8. Food Insecurity due to Climate Change	۷۔ ماحولیات
9. Animal Impact	
Literature ادبیات	
	۱۰۔ میٹھا سچ (طنز و مزاح)
	۱۱۔ سلطانی گواہ (طنز و مزاح)
	۱۲۔ شوگر کوٹ (طنز و مزاح)
	۱۳۔ مال دا سیاپا (طنز و مزاح)
	۱۴۔ بوا مفکر (طنز و مزاح)
	۱۵۔ وہ مسافر بھی گیا (شاعری)

ڈاکٹر سلطان محمود کی دیگر کتب

غذا اور صحت :

غذائی علاج(حصہ اول)
غذائی علاج(حصہ دوم)

Sex Almanac
Fundamentals of Human Nutrition(2001)

ماحولیات/غذائی تحفظ :

ماحولیات

Food Insecurity due to Climate Change
Animal Impact

طنزومزاح:

شوگر کوٹ
سلطانی گواہ
مال دا سیانا

شاعری:

وہ مسافر بھی گیا